محمد مہدی حسن نصر اللہ

میرے والد کے ساتھ میری یادیں

ذکریاتي

معي

شہید سید حسن نصراللہ

رضوان اللہ تعالی علیہ

مترجم: شاکر علی مصطفائی

مرتب: سلمان علی

محمد مہدی حسن نصر اللہ

میرے والد کے ساتھ میری یادیں

معي

ذكرياتي

شہید سید حسن نصراللہ

رضوان اللہ تعالی علیہ

مترجم: شاکر علی مصطفائی

مرتب: سلمان علی

فہرست

عنوان	صفحہ نمبر
انتساب	۲
مقدمہ	۳
پہلا حصہ: جو کچھ میں نے سنا	۶
عقائد اور ایمان کے متعلق	۷
اخلاق کے متعلق	۱۲
خاندان کے بارے میں	۲۲
ہدایت اور نصیحت کے بیان میں	۲۹
جذبات کے بیان میں	۴۴
دوسرا حصہ: جو کچھ میں نے دیکھا	۴۸
ایمان کے بارے میں	۴۹
اخلاق کے بیان میں	۵۷
خاندان کے بیان میں	۶۲
جذبات کے بیان میں	۶۷
جہاد کے بیان میں	۷۰
مہارتوں کے بیان میں	۷۳
مصنف کے بیان میں	۷۶

انتساب

اس کے نام جس نے ہماری زندگیوں میں ایسی عزت بوئی جو کبھی زائل نہیں ہو گی، اور اپنے شرف سے ہمارے سروں کو بلند کیا، اور ہمارے دِنوں کو عزت و وقار کی پناہ گاہیں بنایا۔۔۔

اس کے نام جس نے ہمیں بچانے کے لیے خود خطرے کے دل میں رہنے کو ترجیح دی، پس ہمارے لیے اپنی عمر اور اپنی کوشش کو نچھاور کر دیا، اور اپنے جگر کے ٹکڑے اور اپنی جان کو حق کی راہ میں قربانی کے طور پر پیش کیا۔۔۔

میں بھلا یہ کام آپ کے نام کیسے ہدیہ نہ کروں، جبکہ آپ ہی ہمارے لیے ہر حال اور ہر زمانے میں راستے کو روشن کرنے والے رہنما، مرشد اور مشعلِ راہ رہے ہیں۔۔۔

اس کے نام جو دل اور وجدان میں بستا ہے، اور ہر سانس اور دھڑکن کے ساتھ روح میں دوڑتا ہے۔۔۔

میری اس روح کے نام جو میرے پہلوؤں کے درمیان ہے،

اپنے والد، حزب اللہ کے محترم سیکرٹری جنرل،

امت کے شہیدوں کے سردار، عبدِ صالح،

سید حسن نصر اللہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کے نام،

میں یہ عاجزانہ کام پیش کرتا ہوں،

سچے وفادارانہ اعتراف، اور کبھی نہ ختم ہونے والی لازوال محبت کے تحفے کے طور پر۔

مقدمہ

وہ الفاظ جو دل کی دیوار پر نقش ہو گئے، اور وہ واقعات جنہوں نے یاداشت میں ایسا شعلہ روشن کر دیا جو کبھی بجھ نہیں سکتا۔۔۔

ان کو تحریر کرنا محض گزرتے ہوئے واقعات کو محفوظ کرنا نہیں تھا، بلکہ ایک ایسے شخص کے ساتھ وفاداری تھی جو باپ بھی تھے، معلم بھی اور قدوہ بھی، چنانچہ انہوں نے بچپن ہی سے میری روح میں علم کے بیج بوئے، اور میرے عقل میں نور کے مینار قائم کیے۔

کتنی ہی ایسی سرگوشیاں تھیں جو انہوں نے میرے کانوں میں کیں، اور کتنے ہی ایسے لمحات تھے جو انہوں نے اپنے مبارک وقت سے مجھے خاص طور پر عنایت کیے، پس وہ میرے وجدان میں ایسے نقش بن کر ابھرے جو کبھی مٹ نہیں سکتے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اے ہمارے سیدِ شہید کے پیارو، میں ان لمحات میں آپ کو بھی شریک کروں، تاکہ آپ کے سامنے اس شخص کی وہ تصویر واضح ہو جائے جیسا کہ ہم نے انہیں ان کے قریب رہ کر جانا تھا: ایک ایسی گرمجوش اور انسانی تصویر، جو ان کے خطبات اور عوامی ظہور میں آپ سے پوشیدہ رہی۔

اور جب میں یہ صفحات لکھ رہا ہوں، تو میں انہیں اسی طرح پیش کر رہا ہوں جیسے وہ یاداشت میں محفوظ تھے؛ مکمل سچائی اور سادگی کے ساتھ، بغیر کسی بناوٹ اور اضافے کے۔ اور جو کچھ اس میں وارد ہوا ہے، اس میں سے بعض چیزیں خاص طور پر میری طرف ہی متوجہ تھیں، اور شاید یہ درست نہ ہو کہ انہیں عام کر دیا جائے کہ یہ تمام لوگوں کے لیے ہی احکامات ہیں۔ اور چونکہ میری خواہش تھی کہ یہ مختصر کتاب قاری پر ایک ہلکا پھلکا خلاصہ ثابت ہو، اس لیے میں نے اسے مختصر کہانیوں کی صورت میں ڈھالا ہے، جو اپنے اندر گہرے معنی رکھتی ہیں، دل کے تاروں کو چھوتی ہیں، اور ہمیں غور و فکر کرنے اور عبرت حاصل کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔

تاہم، بعض مواقف تشریح اور وسعت کے متقاضی تھے تاکہ منظر واضح ہو جائے، اور فکر اپنے سیاق و سباق اور زمانے میں مکمل ہو کر سامنے آئے۔

اور اس طرح، ۸۲ کہانیوں پر مشتمل اس تمام کتاب کو دو حصوں میں ترتیب دیا گیا ہے: 'جو کچھ میں نے سنا، اور جو کچھ میں نے دیکھا۔

پہلے حصے میں، میں نے ان گفتگوؤں کا کچھ حصہ ذکر کیا ہے جو میرے اور ان کے درمیان ہوئیں، اور دوسرے حصے میں ان مواقف یا واقعات کا ذکر ہے جن کا میں خود گواہ تھا۔

پس امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کام کو فرمانبرداری اور وفاداری کے ایک ایسے تحفے کے طور پر قبول فرمائے گا، اس شخص کے لیے جس کا ہم سب پر بہت بڑا فضل اور حق ہے کہ ہم انہیں جانیں۔

محمد مهدی نصر الله

بیروت، ۲۰۲۵

سال ۲۰۲۱ء کے آغاز میں جب میرے والد نے پہلی مرتبہ عمامہ میرے سر پر رکھا۔

پہلا حصہ

جو کچھ میں نے سنا

عقائد اور ایمان کے متعلق

عدلِ الٰہی

میں سولہ سال کا تھا، سال ۲۰۱۷ میں، جب میرے دل میں عدلِ الٰہی کے بارے میں ایک سوال پیدا ہوا، جسے میں نے اس دن ایک ایسا سوال سمجھا جس کا جواب فوری طور پر نہیں دیا جا سکتا، بلکہ اس کے لیے غور و فکر، تمہید، اور ایسے عقلی و فکری مقدمات کی ضرورت ہے جو جواب تک پہنچنے سے پہلے لازم ہیں۔

اور طبیعی بات ہے کہ انسان سب سے پہلے اسی کی طرف رجوع کرتا ہے جس کی عقل، علم اور فہم پر اسے بھروسہ ہو۔۔۔ چنانچہ میں نے اپنے پیارے بابا کی طرف رجوع کیا۔

میں نے انہیں فون کیا، اور سلام و بات چیت کے بعد میں نے ان سے کہا: ''میرے پاس ایک اہم سوال ہے''۔

تو انہوں نے مجھے جواب دیتے ہوئے فرمایا: ''بلا جھجک، جو چاہو پوچھو''۔

لیکن میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا: ''میں اپنا سوال اس وقت تک کے لیے مؤخر کرتا ہوں جب میں آپ سے ملوں گا اور آپ سے آمنے سامنے بات کروں گا''۔

اور کچھ ہی وقت بعد، میں نے ان سے ملاقات کی۔ میں ان کے پہلو میں بیٹھ گیا، ہاتھ میں کاغذ اور قلم لیے ہوئے تاکہ جو کچھ سنوں اسے لکھ لوں۔ میں اللہ کے عدل کے برحق ہونے پر ایمان کے لحاظ سے مطمئن تھا، لیکن میں ایک ایسے منہج پر مبنی جواب کی تلاش میں تھا جو دل کے اطمینان کے ساتھ ساتھ عقل کی پیاس کو بھی بجھائے۔

میرا ایک سوال کچھ اس طرح تھا:

''اللہ عزوجل نے کسی ایسے کو پیدا کیا جو معذوری کا شکار ہے، جبکہ دوسرے سلامت ہیں۔۔۔ تو کیا اس میں کوئی ایسی چیز ہے جو

اللہ کے عدلِ جل وعلا کے منافی ہو؟''

انہوں نے سکون سے میری طرف دیکھا، پھر مجھے جواب دیا:

''اس دنیا میں جو کچھ مصائب یا مشکلات پیش آتی ہیں، ان میں سے بعض خود انسانوں کے اپنے ہاتھوں کیئے گئے افعال ہیں۔ لیکن جان لو کہ اللہ کبھی کسی پر ظلم نہیں کرتا، اور ہر وہ شخص جس کا کوئی حق ہے وہ اسے پا کر رہے گا، اگر دنیا میں نہ ملا، تو اس کے بعد برزخ سے لے کر قیامت تک۔۔۔ کیونکہ اللہ کے ہاں کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا''۔

اور انہوں نے اس مفہوم کا اضافہ کیا کہ یہ تکلیف و آزمائش خیر اور بہتری کا سبب ہو سکتی ہے، اور اس میں تکلیف اٹھانے والے کے لیے بہت سے فوائد ہیں، کیونکہ اس میں ایک عظیم معنوی تلافی ہے، بلکہ بعض اوقات دنیاوی تلافی بھی ہوتی ہے جسے انسان دنوں کے گزرنے کے ساتھ دریافت کر لیتا ہے۔

یہ چند الفاظ تھے لیکن وہ ایسی گہرائی اور وضاحت سے بھرپور تھے جو طویل بحث سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔ ایسے براہِ راست، درست اور محکم جوابات جو ایک ہی وقت میں دل اور عقل تک پہنچتے ہیں، اور سولہ سال کے ایک ایسے نوجوان پر معنی کے دریا بہا دیتے ہیں جس کا کوئی حوزوی (مذہبی تعلیم کا) پس منظر نہیں تھا۔

غلو

ایک وقت میں معصومین علیہم السلام کے مقامات کے بارے میں کچھ گفتگو سامنے آئی۔ اور بعض لوگوں نے ان کی یہ صفات بیان کرنا شروع کر دیں کہ وہ 'خالق اور رازق ہیں' اور اسی طرح کی دیگر باتیں۔۔۔

میں نے کچھ نوجوانوں پر ان خطابات کے اثرات کو محسوس کیا، اور رفتہ رفتہ ان کے ذہنوں میں شبہات جنم لینے لگے۔

اپنے والد کے ساتھ ایک نشست میں، میں نے یہ موضوع چھیڑا اور ان کے سامنے یہ سوال رکھا۔ مجھے ان کا جواب حرف بہ حرف تو یاد نہیں، لیکن اس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ کلام غلط اور اشتباہ ہے، بلکہ یہ اس غلو میں سے ہے جو معصومین علیہم السلام کے اوصاف میں ایسی چیزوں کا اضافہ کرتا ہے جو ان کے لیے نہیں ہیں۔

اور انہوں نے واضح کیا کہ جب ہم ان کے لیے ان مبالغہ آمیز اوصاف کو بیان کرتے ہیں، تو ہم ان کی شان و منزلت میں کوئی اضافہ نہیں کر رہے ہوتے، اور اگر ہم ان سے کسی ایسی صفت کا انکار بھی کر دیں جس سے وہ متصف ہیں، تب بھی ان کے مرتبے میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔۔۔ پس ہمیں اس بات کا دھیان رکھنا چاہیے کہ ہم کسی بھی ایسی گفتگو کے پیچھے نہ بہہ جائیں جو محض جذبات کی وجہ سے ہو، کیونکہ جذبات بعض اوقات ہمیں حقیقت سے اندھا کر دیتے ہیں، بلکہ ہم تو دلیل والے لوگ (ابناء الدلیل) ہیں، لہٰذا ہمارے لیے جائز نہیں ہے کہ ہم ان کے حق میں کوئی کمی یا اضافہ کریں اور انکے لیے وہی بات کہنی چاہیے جو دلیل سے ثابت ہو۔

تعقیب (نماز کے بعد کے اذکار)

ان کی ایسی وصیتوں میں سے جنہیں میں کبھی نہیں بھولتا، یہ ہے کہ میں ہمیشہ نماز کے بعد تعقیب کا التزام کروں۔ انہوں نے ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا: ''اپنی عادت بناؤ کہ نماز مکمل کرنے کے بعد کچھ دیر کے لیے اسی جگہ، نماز کے مصلّے پر ہی ٹھہرے رہو، خواہ وہ مختصر وقت کے لیے ہی کیوں نہ ہو، اور نماز کے بعد کا تمہارا وقت تعقیب سے خالی نہیں ہونا چاہیے، چاہے وہ کوئی ایک ہی عمل کیوں نہ ہو جیسے کہ جنابِ سیدہ زہرا علیہا السلام کی تسبیح۔'' پھر انہوں نے مجھے ہر نماز کے بعد عام تعقیبات میں سے یہ دعا پڑھنے کی نصیحت فرمائی:

سُبحانَ مَن لا يَعتَدي عَلى أهلِ مَملكَتِهِ سُبحانَ مَن لا يأخُذُ أهلَ الأرضِ بِألوانِ العَذابِ سُبحانَ الرَّؤُوفِ الرَّحيمِ اللّٰهُمَّ اجعَل لي في قَلبي نوراً وَبَصَراً وَفَهماوَعِلماً. إنَّكَ عَلى كُلِّ شيءٍ قَديرٌ

ترجمہ۔۔ پاک ہے وہ ذات جو اپنی سلطنت کے رہنے والوں پر زیادتی نہیں کرتی، پاک ہے وہ ذات جو زمین والوں کو طرحِ طرح کے عذاب میں مبتلا نہیں کرتی، پاک ہے وہ جو نہایت شفیق اور رحم کرنے والا ہے۔ اے اللہ! میرے دل میں نور، بصیرت، سمجھ اور علم قرار دے۔ یقیناً تو ہر چیز پر قادر ہے۔

وہ تعقیبات کی پابندی کرنے پر بہت تاکید فرماتے تھے کیونکہ یہ مستحباتِ مؤکدہ میں سے ہیں، بلکہ ان سے منہ پھیرنا ایک نقصان ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جب بندہ نماز سے فارغ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجت کا سوال نہیں کرتا، تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرماتا ہے: 'میرے بندے کو دیکھو، اس نے میرا فریضہ تو ادا کر دیا لیکن مجھ سے اپنی حاجت کا سوال

نہیں کیا، گویا وہ مجھ سے بے نیاز ہو گیا ہے، اس کی نماز لے لو اور اس کے چہرے پر مار دو"۔ (۱)

حسنیؑ الہویٰ (امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام سے عشق رکھنے والے)

جب مجھے اور میری بیوی کو معلوم ہوا کہ ہمارے ہاں تیسرے بچے کی پیدائش لڑکی (بیٹی) کی صورت میں ہونے والی ہے، تو ہم عام طور پر بچوں کے نام رکھنے کے موضوع پر بابا سے بات کر رہے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ وہ لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے اہل بیت علیہم السلام کے ناموں پر نام رکھنا پسند کرتے ہیں، اور لڑکیوں کے معاملے میں وہ آئمہ علیہم السلام کی ماؤں اور بیٹیوں کے ناموں پر نام رکھنا بھی پسند کرتے ہیں۔

پھر اپنے نام 'حسن' کے حوالے سے انہوں نے ایک لطیف بات کہی، فرمایا: "جب کچھ لوگ مجھ سے اپنے بیٹے کا نام رکھنے کی فرمائش کرتے ہیں، تو میں یہ پسند کرتا ہوں کہ انہیں حسن نام رکھنے کی تجویز دوں، تاکہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے نام سے برکت حاصل کی جا سکے، لیکن اس خوف سے کہ کہیں ان میں سے کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ میں اپنے نام کی مناسبت سے یہ تجویز دے رہا ہوں، اس لیے میں انہیں یہ نام تجویز نہیں کرتا تھا"۔

ان کی یہ گفتگو ان کی کمالِ عاجزی وانکساری اور امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام سے ان کی گہری محبت کی ایک نئی دلیل تھی، جن کی مظلومیت کو وہ ہمیں یاد دلانا اور ان کی یاد کو ہمارے دلوں میں زندہ رکھنا پسند کرتے تھے۔

العمل بالمأثور (روایاتِ اہلِ بیت میں وارد شدہ اعمال پر عمل)

ہم ان کی طرف رجوع کرنا پسند کرتے تھے، تاکہ ان سے کسی عمل یا ذکر کی درخواست کریں۔۔۔ ہم ایک ایسی چابی کی تلاش میں ہوتے تھے جو ہمیں اللہ کے قرب کی طرف لے جائے، اور ہم جانتے تھے کہ وہ اس راستے پر چل چکے ہیں، تو بھلا اس شخص سے بہتر کون ہو سکتا ہے جس نے راستے کا تجربہ کیا ہو اور اس کی رہنمائی کی ہو؟

---

(۱) میرزا النوری، مستدرک الوسائل، جلد ۵، صفحہ ۲۹

شاید کچھ لوگ یہ گمان کریں کہ وہ ہمیں نئے اعمال بتاتے ہوں گے، لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ جب بھی ہمیں کچھ عطا کرنا چاہتے، تو اہل بیت علیہم السلام سے مروی (ماثور) اعمال میں سے ہی عطا فرماتے تھے، یا پھر ہم سے فرماتے تھے: ''کتاب مفاتیح الجنان کھولیں''۔ (۱)

(۱) کتاب ''مفاتیح الجنان''، شیعہ مسلمانوں کے ہاں ادعیہ، زیارات اور مستحب اعمال کی جامع ترین، مشہور ترین اور اہم ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ اسے شیخ عباس قمیؒ نے جمع کیا ہے۔

اخلاق کے متعلق

ان کے چہرے کے تاثرات بدل گئے

سال ۲۰۲۳ء میں، میں شہرِ مشہدِ مقدس میں لیالیِ قدر (قدر کی راتوں کی عبادات) منا رہا تھا، پھر اس کے بعد عید الفطر کے دنوں میں، میں شہرِ قمِ مقدس کی طرف روانہ ہوا، جہاں میری ملاقات اہلِ معنی اور معرفت (اہلِ باطن) کے علماء میں سے ایک عالمِ دین سے ہوئی۔

ہمارے درمیان حوزہ علمیہ اور کچھ دوسرے امور کے بارے میں گفتگو ہوئی، اور اسی دوران ان عالمِ دین نے محترم سید حسن نصر اللہ کی مدح وثنا میں بڑے بڑے کلمات کہے۔

میں نے جو کچھ بھی کہا گیا تھا وہ سب لکھ لیا، اس نیت سے کہ میں اسے بعد میں اپنے بابا کے سامنے پیش کروں گا اور اُن سے اِن موضوعات پر بات چیت کروں گا۔

اور جب میں واپس لوٹا، تو میں ان سے تنہائی میں ملاقات کے لیے گیا، اور اپنے ساتھ وہ کاغذ لے گیا جس پر میں نے اس ملاقات کا خلاصہ لکھ رکھا تھا۔

میرے بابا نے مشہد اور قم کے بارے میں، اور وہاں کی عبادات کے متعلق پوچھنا شروع کیا، اور میں انہیں جواب دیتا رہا، پھر میں نے کاغذ پر جو کچھ لکھا تھا اسے ان کے سامنے پڑھنا شروع کیا۔ انہوں نے میری بات کو توجہ سے سنا، جیسا کہ ان کی عادت تھی، وہ سکون سے اور بغیر بات کاٹے سنتے تھے، اور وہ ایک بہترین سامع تھے۔

لیکن جیسے ہی میں مدح وثنا والے حصے پر پہنچا، تو میں نے کاغذ سے اپنی نظریں اٹھائیں اور ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔۔۔

میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے کے تاثرات بدل چکے تھے، ان کی تیوریاں چڑھ گئی تھیں، اور ان پر ناگواری کے آثار نمایاں تھے۔ ایک لمحے کے لیے، مجھے ان کے رعب سے ڈر لگا، جبکہ وہ ایسے تھے کہ انہوں نے مجھ پر کبھی غصہ نہیں کیا تھا، نہ کبھی اپنی آواز بلند کی تھی،

اور نہ ہی کبھی میرے سامنے ماتھے پر بل لائے تھے۔

میں نے ان سے پوچھا: ''کیا کوئی ایسی چیز ہے جس نے آپ کو ناراض کر دیا ہے؟''

توانہوں نے واضح ناگواری کے ساتھ مجھے جواب دیا: ''نہیں''۔

اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں ایک ایسا حصہ پڑھ رہا تھا جس میں ان کی مدح وثنا تھی، اور وہ بنیادی طور پر اپنی مدح پسند نہیں کرتے تھے، کیونکہ وہ ان ترانوں کی تشہیر کو بھی مسترد کر دیتے تھے جن میں ان کی ذات کی تعریف ہوتی تھی، یہاں تک کہ وہ چوک چوراہوں میں اپنی تصاویر لگانے سے بھی منع فرماتے تھے۔

چنانچہ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں نے فوراً اس حصے کو چھوڑ دیا تاکہ انہیں مزید ناگواری نہ ہو۔

صفات میں اعتدال

ایک مرتبہ، میں نے اپنے والد کو فون کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ مجھے ایک مختصر اخلاقی درس دیں۔

انہوں نے اپنی روایتی فیاضی کے ساتھ میری درخواست قبول فرمائی، اور ان کی گفتگو صفات میں اعتدال کے بارے میں تھی، جہاں فضیلت دو رذیلتوں یعنی افراط اور تفریط کے درمیان (وسط) میں ہوتی ہے۔

انہوں نے اس وقت سخاوت (کرم) کی صفت کے بارے میں بات کی، وہ اعلیٰ خصلت جو انسان کو زینت بخشتی ہے اور اسے عزت و توقیر کا مرکز بناتی ہے۔ لیکن یہ ایک پاکیزہ پودے کی طرح ہے؛ اگر اس کی آبیاری حد سے بڑھ جائے تو وہ مرجھا جاتا ہے، اور اگر کم ہو جائے تو وہ سوکھ جاتا ہے، پس یہ دو مد مقابل رذیلتوں کے وسط میں واقع ہے: ایک بخل جو خیر کے کاموں سے معذور اور دور کر دیتا ہے، اور دوسرا اسراف جو طاقت اور مال کو برباد کر دیتا ہے۔

پھر انہوں نے اپنی گفتگو کے بعد ایک ایسے راستے پر روشنی ڈالی جس پر انسان چل کر کسی رذیلت سے چھٹکارا پا سکتا ہے، اور فضیلت والوں کے مرتبے تک پہنچ سکتا ہے۔

مثال کے طور پر، جو شخص اپنے نفس کے بخل کا اسیر ہو، اور اس بری صفت کی زنجیروں کو توڑنا چاہتا ہو، تو اس کے لیے سب سے

زیادہ مؤثر طریقوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ عطا کرنے کی مشق کرے اور دل کھول کر نچھاور کرنے کی تربیت حاصل کرے، خواہ شروع میں اس معاملے میں کچھ سوچی سمجھی اور نپی تلی مبالغہ آرائی ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ چنانچہ وہ کثرت سے تحائف دے، صدقات دینے میں جلدی کرے، اور اپنے نفس کو ایسا نرم وفیاض بنائے جو کسی مانگنے والے یا ضرورت مند کو خالی ہاتھ نہ لوٹائے، یعنی وہ بالکل اس کے برعکس کرے جو ایک بخیل شخص کرتا ہے۔

اور یہ تدریجی راستہ مال کے ساتھ وابستگی کے طوق کو توڑنے میں اس کی مدد کرتا ہے، اس کے بخیل نفس کو نرم کرتا ہے، اور اسے رفتہ رفتہ سخاوت کا عادی بناتا ہے۔۔۔ یہاں تک کہ وہ بخل کی قید سے مستقل طور پر آزاد ہو جائے۔

پھر جب سخاوت اس کے نفس میں ایک راسخ خُلق (پکی عادت) اور ایک ایسی قدرتی خصلت بن جائے جس سے وہ متصف ہو، تو اس پر واجب ہے کہ وہ دوبارہ توازن کی طرف لوٹ آئے تاکہ اس ابتدائی افراط کی شدت میں اعتدال لائے، اور خوبصورت حدِ اعتدال پر رک جائے؛ تاکہ وہ سخاوت کے گھنے سائے والے نخلستان میں رہے، اور اسراف کے بنجر صحرا کی طرف نہ بہہ جائے، کہ کہیں ایک رذیلت سے نکل کر دوسری رذیلت میں منتقل نہ ہو جائے۔

محب کو ردنہ کرو

میری دادی کی تدفین کے مراسم کے فوراً بعد، ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو گمان میں نہیں تھا؛ ہوا یوں کہ محترم سید کے چاہنے والوں میں سے ایک شخص میرے قریب آیا، اور میرے ہاتھ سے ایک چیز لے لی، تاکہ وہ میرے ''سید کا بیٹا'' ہونے کی وجہ سے اسے ایک یادگار کے طور پر اپنے پاس محفوظ رکھ سکے، لیکن اس چیز کی نوعیت ایسی تھی کہ اگر وہ اس کے پاس چھوڑی جاتی تو یہ میرے لیے سخت خفت و شرمندگی کا باعث بنتی اور میرے نفس پر اس کا منفی اثر پڑتا۔

چنانچہ میں نے شائستگی سے معذرت کرتے ہوئے وہ چیز نرمی سے اس سے واپس لے لی، پھر میں گھر لوٹ آیا جبکہ میرے سینے میں ایک بے چینی تھی؛ کہ جو کچھ میں نے کیا وہ صحیح تھا یا غلط؟

میں نے جو کچھ ہوا تھا اسے اپنے والد کے سامنے رکھا، اور اسی وقت، میں نے اخلاقیات کے علماء میں سے بھی چند لوگوں سے مشورہ

کیا، تو ان سب کی رائے یہ تھی کہ جو کچھ میں نے کیا وہ درست تھا، بلکہ اپنے نفس کے خلاف جہاد کرنے اور اس کی سرکشی کو لگام دینے کے لیے زیادہ مناسب تھا۔

تاہم، میرے بابا کا جواب بالکل مختلف تھا۔ انہوں نے مجھ سے فرمایا: ''تم نے غلطی کی!'' پھر انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے بات آگے بڑھائی: ''آئندہ کے لیے، وہ جو چاہتا ہے اسے دے دو، خواہ اس سے تمہیں خفت ہی کیوں نہ اٹھانی پڑے۔۔۔ کیونکہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ تم کسی چاہنے والے کو رد نہ کرو''۔

وہ مجھے ایک اعلیٰ مرتبے کی طرف لے جا رہے تھے، اس بات کی طرف کہ میں آخری حد تک اپنے نفس سے جہاد کروں، اور اپنے آرام و سکون کے دائرے سے باہر نکلوں، تاکہ میں کسی محبت کرنے والے دل کو ٹھیس نہ پہنچاؤں۔

ان کی نظر میں یہ راستہ اُس راستے سے زیادہ بلند و برتر تھا جسے میں نے چنا تھا، بلکہ انسان اُس وقت نفسیاتی طور پر راحت پا جاتا ہے، اور یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے دل کی وسعت کے ساتھ اپنی ذات سے بالاتر ہو چکا ہے، چنانچہ وہ اپنی عاجزی اور اپنی روح کی بلندی سے مطمئن ہو جاتا ہے۔

پس ان کا یہ جملہ میری روح میں ایک نئے نور کی مانند تھا جس نے ایک اعلیٰ اخلاقی راستے کو روشن کر دیا، جہاں عطا کرنا، خواہ خفت کے وقت ہی کیوں نہ ہو، روک لینے سے زیادہ خوبصورت ہوتا ہے، اور محبت کرنے والوں کا بھرم رکھنا عارضی دلی راحت سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔

لوگوں کی دلجوئی اور رعایت

میں نے ۱۷ اکتوبر ۲۰۲۳ء سے پہلے اپنے والد سے اجازت لی تھی کہ میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ مشہدِ مقدس کا سفر کروں؛ تاکہ سال ۱۴۴۵ھ / ۲۰۲۴ء کے ماہِ رمضان المبارک میں امام رضا علیہ السلام کی زیارت کا شرف حاصل کروں اور وہاں لیالیِ قدر (قدر کی راتیں) مناؤں۔ اور انہوں نے اپنی روایتی شفقت کے ساتھ میری درخواست منظور فرمالی تھی۔

لیکن سفر کی طے شدہ تاریخ سے دو دن پہلے، میں نے اپنی والدہ سے سنا: ''تمہارے والد تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔۔۔ معاملہ اہم

ہے"۔

میں نے اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کر لیا کہ یہ گفتگو اسی زیارت کے بارے میں ہو سکتی ہے جس کا میں شدت سے منتظر تھا۔

مجھے جیسے ہی پہلا موقع ملا میں نے انہیں فون کیا، اور سلام و خیریت دریافت کرنے کے بعد انہوں نے اپنی دھیمی آواز میں مجھ سے فرمایا: "میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ تم افسردہ ہو"۔

تو میں نے پورے اطمینان سے انہیں جواب دیا: "نہیں اے ابّا جان!۔۔۔ آپ جو کچھ بھی فرمائیں گے وہ مجھے غمگیں نہیں کرے گا"۔

تو انہوں نے کمالِ شفقت اور حکمت کے ساتھ فرمایا: "میں چاہتا ہوں کہ تم یہ سفر منسوخ کر دو"۔

میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ہچکچایا، اور میں نے فوراً اُن سے کہا: "جی حاضر۔۔۔ ایسا ہی ہو گا"۔

اور وہ جانتے تھے کہ جب وہ ہم سے کسی چیز کا تقاضا کرتے ہیں، تو ہم کبھی وجہ نہیں پوچھتے اور نہ ہی عمل کرنے میں ہچکچاتے ہیں؛ یہ ان کی حکمت پر ہمارے بھروسے، ان کی محبت پر ایمان، اور ان کی اسی مدارات کی قدر دانی کی وجہ سے تھا جو ہم نے ان سے ہی سیکھی تھی۔

اور چونکہ وہ اس زیارت کے لیے ہمارے شوق کی گہرائی کو جانتے تھے، اور یہ سمجھتے تھے کہ یہ ہماری کتنی قیمتی تمنا تھی، اس لیے انہوں نے اپنے اعلیٰ اخلاق کے باعث گفتگو جاری رکھتے ہوئے وضاحت فرمائی کہ اس کی وجہ لوگوں کی دلجوئی اور رعایت ہے:

کیونکہ ان دنوں میں (لبنان میں) شہداء، زخمی اور بے گھر لوگ موجود ہیں۔۔۔ یہ ان کا وہ انسانی نقطۂ نظر تھا جو دوسروں کے دکھ اور تکلیف کے وقت ان کے لیے وسعت رکھتا تھا۔

جب میں نے فون بند کیا، تو میری بیوی نے میری طرف متوجہ ہو کر پوچھا: "کیا یہ سفر کے متعلق کوئی بات تھی؟"

تو میں نے سکون سے اسے جواب دیا: "ہاں۔۔۔ ہم نے اس سفر کو منسوخ کر دیا ہے"۔

وہ میرے چہرے پر ناگواری یا غم کا کوئی بھی اثر نہ دیکھ کر حیران رہ گئی، گویا یہ ایک بالکل معمولی بات ہو!

تو میں نے اس سے کہا: "میرے لیے خوشی اور فرض اُن کی اطاعت کرنے میں ہے۔۔۔ جہاں تک زیارت کا تعلق ہے، تو وہ مستحب

ہی رہے گی''۔

ذکرِ الٰہی کا دوام

اپنی آخری نشستوں میں سے ایک نشست میں، میرے والد نے مجھ سے اللہ عزوجل کے ذکر کے مراتب کے بارے میں گفتگو فرمائی، توانہوں نے مجھ سے فرمایا: ''یقیناً ذکر صرف زبان سے الفاظ ادا کرنے میں ہی محدود نہیں ہے، بلکہ اس کے گہرے مقامات ہیں، جن میں سے ایک ذکرِ قلبی ہے''۔

پھر انہوں نے میرے سامنے ایک مثال رکھی اور فرمایا: ''اگر تم کام کر رہے ہو، یا لوگوں کے ساتھ بیٹھے ہو، اور تم ذکر کی حالت میں رہنا چاہتے ہو۔۔۔ تو یہ ضروری نہیں ہے کہ تم تسبیح ہاتھ میں پکڑو یا زبان سے الفاظ ادا کرو۔ تم اپنے دل میں اللہ کا ذکر کر سکتے ہو، بغیر زبان ہلائے کسی خاص ذکر کو دل میں دہرانے کے ذریعے، یا اللہ کی نشانیوں اور اس کی تخلیقات میں غور و فکر کرنے کے ذریعے۔۔۔''۔

پھر انہوں نے مسکراتے ہوئے ایک لطیف مزاح کا اضافہ کیا اور فرمایا: ''رہا معاملہ گھر کا، تو اپنی بیوی کے سامنے ریاکاری (دکھاوے) کا خوف رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ تم وہاں سکون سے تسبیح ہاتھ میں پکڑ سکتے ہو اور اپنے رب کا ذکر کر سکتے ہو!''۔

نیت عمل کی روح ہے

ایک دن، میں نے اپنے والد سے پوچھا: ''کیا مجھے ہر عمل کے وقت نیت کے بارے میں سوچنا چاہیے؟ یعنی کیا میں اپنے ذہن میں یہ حاضر کروں کہ میں یہ کام اللہ تعالیٰ کے قرب کی خاطر کر رہا ہوں؟''

تو انہوں نے حکمت کے ساتھ مجھے جواب دیا: ''شروع میں۔۔۔ ہاں، اس طرف توجہ دینا اچھا ہے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ، نیت ایک راسخ ملکہ (پکی عادت) بن جاتی ہے۔ تب پورا عمل اسی نیت کی وجہ سے خود بخود (تلقائی طور پر) جاری ہوتا ہے، بغیر اس کے کہ ہر فعل پر رکنے کی ضرورت پڑے''۔

پھر میں نے ان سے پوچھا: ''اگر میں نے کوئی کام کسی دوسری غرض کے لیے کیا ہو، تو کیا میں اس کے مکمل ہو جانے کے بعد اپنی

نیت بدل سکتا ہوں، اور اللہ کے قرب کی نیت کر سکتا ہوں؟''

توانہوں نے بالکل واضح اور بلاشبہ جواب دیا: ''نہیں، نیت عمل کی چابی ہے، اور عمل شروع ہی سے اِسی کے تابع ہوتا ہے''۔

احسان شناسی اور شکر گزاری

محترم سید حسن نصر اللہ ان لوگوں میں سے تھے جو احسان کا اعتراف کرتے ہیں اور نیکی کی ستائش کرتے ہیں، بلکہ وہ چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے معاملے میں بھی بار بار شکریہ اور ممنونیت کا اظہار کرتے تھے۔

اور شہداء کے ساتھ، اور ہر اس شخص کے ساتھ جس نے مقاومتِ اسلامی اور اس کے لوگوں کی خدمت کے لیے کچھ بھی پیش کیا ہو، وفاداری کے معاملے میں کوئی شاذ و نادر ہی ان کے مرتبے کو پہنچ پاتا تھا۔

ایک مرتبہ، انہیں اپنے ذاتی کمپیوٹر (لیپ ٹاپ) میں ایک معمولی سا مسئلہ درپیش ہوا، تو میں نے اسے حل کرنے میں ان کی مدد کی، اور انہیں ایک ایسا طریقہ بتا دیا جس کی مدد سے وہ جب بھی چاہیں اس مسئلے سے بچ سکتے تھے۔ تو ان کا چہرہ ایک سچی مسکراہٹ سے چمک اٹھا، اور انہوں نے لطیف کلمات کے ساتھ میرا شکریہ ادا کیا۔

اور برسوں گزر گئے، وہ جب بھی اس طریقے کو استعمال کرتے، مجھے یاد کرتے اور فرماتے: ''میں جب بھی اس مرحلے پر پہنچتا ہوں، تو مجھے تم یاد آجاتے ہو''۔

شرعی احکام میں باریک بینی و احتیاط

دینِ مبین کے احکام کے ساتھ معاملہ کرتے وقت میرے والد تحقیق اور توثیق کے معاملے میں ایک بہترین نمونہ تھے۔ وہ کبھی بھی مبہم دائرے یا ظن و گمان پر تکیہ کرنے کو پسند نہیں فرماتے تھے، بلکہ احتیاط اور باریک بینی وہ میزان تھے جو کبھی ان کے ذہن سے اوجھل نہیں ہوتے تھے۔

انہوں نے کچھ واجب شرعی احکام خود مجھے سکھانا شروع کیے، اور وہ وضو اور نماز کے وقت میری نگرانی فرماتے تھے تاکہ ان کی صحیح

طریقے سے ادائیگی کو یقینی بنا سکیں۔

اور سال ۲۰۲۴ء میں، انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ میں کتابوں کا ایک مجموعہ ان کی طرف سے تحفے کے طور پر ایک حوزہ علمیہ تک پہنچادوں۔ تو میں نے ان سے پوچھا: ''اگر ان میں سے کوئی کتاب مجھے پسند آجائے تو کیا میں اس میں سے کچھ لے سکتا ہوں؟''

تو انہوں نے مجھے جواب دیا: ''جب تک یہ کتابیں اُن تک پہنچی نہیں ہیں، اور اُنہوں نے اس پر قبضہ نہیں کیا ہے، تب تک ہدیہ لازم نہیں ہوا، اس لیے اس میں کوئی حرج نہیں ہے''۔ چنانچہ میں نے صرف ایک کتاب لے لی اور انہیں اس کی خبر دے دی۔

اور خاندانی نشستوں میں، جب ہم ان کے سامنے کوئی فقہی سوال رکھتے تھے، تو وہ بعض اوقات جواب دینے میں تاخیر فرماتے تھے؛ یہ کسی لاعلمی کی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ حکم صادر کرنے سے پہلے توثیق ویقین حاصل کرنے کی ان کی تڑپ کی وجہ سے تھا۔ وہ اس وقت تک ایک لفظ بھی بولنا پسند نہیں فرماتے تھے جب تک انہیں جواب کی باریک بینی اور اس کے درست ہونے پر پورا اطمینان نہ ہو جائے۔

مستضعفین سے محبت

۲۰۱۰ء کے فٹبال ورلڈ کپ کی راتوں میں سے ایک رات، میں بیٹھا ایک میچ دیکھ رہا تھا، جو غالباً ارجنٹائن اور نائجیریا کے درمیان تھا کہ اسی دوران میرے والد کمرے میں داخل ہوئے، وہ مسکراتے ہوئے میرے پہلو میں بیٹھ گئے اور انہوں نے مجھ سے ایک لطیف معنی خیز لہجے میں پوچھا: ''تمہارے خیال میں کون جیتے گا؟''

میں نے ایک میچوں پر نظر رکھنے والے شخص کے جیسے پورے اعتماد کے ساتھ جواب دیا: ''یقیناً ارجنٹائن جیتے گا، کیونکہ وہ کہیں زیادہ مضبوط ہے''۔

تو انہوں نے ایک ایسے سکون کے ساتھ جواب دیا جس کے اندر ایک گہری حکمت چھپی ہوئی تھی، فرمایا: ''جہاں تک میرا تعلق ہے، تو میں نائجیریا کی حمایت کروں گا''۔

میں نے تعجب سے کہا: ''اور وہ کیوں؟ ان کی ٹیم تو مضبوط نہیں ہے!''

تو انہوں نے یکجہتی کے پیغام سے شناسا عارف کی عاجزی کے ساتھ جواب دیا: ''میں ان کی حمایت اس لیے کر رہا ہوں کیونکہ وہ

مستضعف ہیں"۔

یہ واقعہ برسوں میرے ذہن میں نقش رہا۔۔۔اس وقت میں اس کا پورا مطلب نہیں سمجھ پایا تھا، لیکن میں نے اسے اچھی طرح یاد رکھا کہ آخر ان کے ایک مستضعف قوم ہونے اور فٹبال کے درمیان کیا تعلق ہے؟

اور جب میں بڑا ہوا۔۔۔تو میں سمجھ گیا کہ یہ موضوع فٹبال سے جڑا ہوا نہیں تھا، بلکہ ہر اس مستضعف سے جڑا تھا جو مظلوم ہے۔۔۔سید حسن نصر اللہ کمزوروں کی حمایت محض ایک انسانی، اخلاقی یا شرعی جذبے کے تحت ہی نہیں کرتے تھے، بلکہ وہ ان سے محبت بھی کرتے تھے...

قوانین کی پابندی

اگر میرے والد چاہتے تو وہ نہایت آسانی سے ہمارے لیے راستہ ہموار کر سکتے تھے اور ہمارے معاملات کو آسان بنا سکتے تھے، خواہ اس کے لیے سفارش یا اثر ورسوخ کی ہی ضرورت کیوں نہ ہوتی۔

کیونکہ ان کا سماجی مقام و مرتبہ اور لوگوں کی ان سے محبت، اُن کے مختلف عہدوں اور پوزیشنوں کے باوجود، بند دروازوں کو کھولنے اور ان مشکلات کو آسان کرنے کے لیے کافی تھی جنہیں معمولی نہیں سمجھا جاتا۔

لیکن انہوں نے۔۔۔ کبھی ایسا نہیں کیا۔

وہ قدس اللہ سرہ ایسے نہیں تھے؛ وہ قانون میں ایک ایسا تقدس دیکھتے تھے جسے پامال نہیں کیا جا سکتا، اور ایک ایسا اصول مانتے تھے جسے چھوا نہیں جا سکتا۔

قوانین کے ساتھ ان کی وابستگی ایک ایسی سخت پابندی تھی جو کسی الٰہی امر کے سامنے کھڑے ہونے سے مشابہ تھی، وہ اس میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے تھے، اور چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں بھی اپنے نفس کے ساتھ نرمی نہیں برتتے تھے۔ انہوں نے کبھی بھی اپنے آپ کو قوانین سے مستثنیٰ نہیں سمجھا، اور جو چیز دوسروں پر حرام کی، اسے کبھی اپنے لیے حلال نہیں جانا۔

ایک مرتبہ، مجھے حزب اللہ کے اداروں میں سے ایک ادارے میں ملازمت حاصل کرنے کا موقع ملا، اور میں اس کے لیے بہت

پر جوش تھا، لیکن میری عمر ایک رکاوٹ تھی، جو مطلوبہ قانونی عمر سے صرف ایک یا دو ماہ کم تھی، اور اگر میں فوراً اس ملازمت سے نہ جڑتا، تو یہ موقع اگلے سال تک کے لیے میرے ہاتھ سے نکل جاتا۔

میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ کوئی راستہ نکال دیں۔۔۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا، اور مجھ سے اگلے سال تک انتظار کرنے کو کہا۔ اسی طرح ضرورت کے باوجود انہوں نے مجھے کار یا موٹر سائیکل رکھنے کی اجازت بھی نہیں دی، یہاں تک کہ میں قانونی عمر کو پہنچ گیا اور میں نے سرکاری لائسنس حاصل کر لیا۔

میں نہیں جانتا

میں نے ایک دن ان سے ایک عام سے شرعی حکم کے بارے میں پوچھا، لیکن وہ ذرا تفصیلی اور حساس مسئلہ تھا، چنانچہ میں نے یہ توقع کی کہ وہ فوراً جواب دے دیں گے۔

انہوں نے چند لمحات کے لیے سوچا، پھر فرمایا: ''میں نہیں جانتا''۔

انہوں نے یہ بات بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کہی، پھر بات جاری رکھتے ہوئے فرمایا: ''مجھے اس کے بارے میں تحقیق کرنے دو، میں تمہیں جواب دے دوں گا''۔

اس جواب کے اندر نفس کے خلاف جہاد کا ایک بہت بڑا حصہ موجود ہے، اور اس میں وہ تقویٰ ہے جو اللہ سے ان کے خوف کی دلالت کرتا ہے، کیونکہ کسی عالم کے لیے یہ کہنا آسان نہیں ہوتا کہ ''میں نہیں جانتا''۔

خاندان کے بارے میں

انتخاب کی آزادی

ہمارے والد ہمیں کبھی کسی چیز پر مجبور نہیں کرتے تھے، جب تک کہ وہ معاملہ شرعی طور پر واجب یا حرام کے دائرے سے باہر ہوتا۔

جب میں نے اسکول کی تعلیم مکمل کی، توانہوں نے مجھے کسی خفت میں ڈالے یا کسی بھی قسم کا دباؤ محسوس کرائے بغیر مجھ سے پوچھنے میں پہل کی: ''تمہارا کیا خیال ہے کہ تم حوزوی (دینی) تعلیم کا آغاز کردو؟''

ان کا یہ سوال ایک براہِ راست تجویز کے بجائے ایک لطیف دعوت سے زیادہ مشابہ تھا۔ تو میں نے پورے سکون اور اس اطمینان کے ساتھ انہیں جواب دیا کہ وہ مجھے کسی چیز پر مجبور نہیں کریں گے: ''نہیں!''، پھر میں نے کہا: ''بلکہ میں یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہتا ہوں، لیکن میں ابھی تک کچھ شعبوں کے درمیان تذبذب کا شکار ہوں''۔ اور جیسا کہ میری ان سے ہمیشہ کی عادت تھی، انہوں نے اس کی مخالفت نہیں کی۔

میں نے اپنے چنے ہوئے ایک شعبے میں پڑھنا شروع کیا، پھر میں دوسرے شعبے کی طرف منتقل ہو گیا، اور وہ بغیر کسی اعتراض کے ہمیشہ مجھے انتخاب کی آزادی دیتے تھے۔

پھر کچھ ہی عرصے بعد میں نے حوزے میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا، تو وہ بہت خوش ہوئے اور اس خیال کا خیر مقدم کیا۔ لیکن تقریباً ایک سال بعد مجھے یہ محسوس ہوا کہ یونیورسٹی کی تعلیم میری حوزوی تعلیم پر بوجھ بن رہی ہے، اور وہاں میری علمی ترقی پر منفی اثر ڈال رہی ہے۔

جبکہ یونیورسٹی سے میری گریجویشن میں صرف تھوڑا ہی وقت باقی تھا...

میں نے یہ معاملہ ان کے سامنے رکھا اور ان سے پوچھا: ''کیا آپ کو کوئی اعتراض ہے اگر میں یونیورسٹی چھوڑ دوں تاکہ حوزے کے

لیے زیادہ وقت مہیا کر سکوں؟''

توانہوں نے جواب دیا: ''مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے''۔

لیکن میں نے دوبارہ اس پر مزید غور کیا، اور کچھ دوستوں سے مشورہ کیا، اور یہ فیصلہ کیا کہ یونیورسٹی کے باقی ماندہ مضامین مکمل کر لوں...

اور یہی میں نے کیا، میں نے گریجویشن مکمل کی، اور پھر میں نے اپنے آپ کو مکمل طور پر حوزے کے لیے وقف کر دیا۔

انہوں نے کبھی ہم پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا، اور نہ ہی ہمارے کسی بھی انتخاب پر ہمارے اندر گناہ یا غلطی کا احساس پیدا کیا۔

وہ رہنمائی فرماتے تھے۔۔۔اور فیصلہ ہمارے لیے چھوڑ دیتے تھے۔

اللہ کی موجودگی میں کوئی خوف نہیں

میری عمر تقریباً سات سال تھی، اور میں بہت سے بچوں کی طرح اندھیرے کمروں میں داخل ہونے سے ڈرتا تھا۔ ایک رات، میں نے اُن سے اپنے اس ڈر کا شکوہ کیا اور کہا: ''ابّا جان، میں اندھیرے کمرے میں داخل ہونے سے ڈرتا ہوں''۔

وہ مسکرائے، اور انہوں نے شفقت سے میری طرف دیکھا اور مجھ سے پوچھا: ''کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے دونوں کندھوں پر دو فرشتے موجود ہیں؟''

میں نے ان سے کہا: ''جی ہاں! (جانتا ہوں)''۔

توانہوں نے فرمایا: ''پھر، مت ڈرو''۔

ان الفاظ کے ذریعے وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ اللہ اور اس کے فرشتوں کی موجودگی کے احساس کے ہوتے ہوئے کوئی خوف نہیں ہو سکتا، پس یہ بات میرے دل پر اثر کر گئی اور اس نے وہاں سے خوف کو ایسے نکال باہر کیا گویا وہ سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔

اُنہیں مت جگاؤ!

جولائی ۲۰۰۶ء کی جنگ کے بعد میں ایک چھوٹا بچہ تھا، اور اس وقت کے امن و امان کے کشیدہ حالات نے میرے والد کی نقل و حرکت کو بہت زیادہ محدود کر دیا تھا، پس یہ ایک لازمی الٰہی توفیق تھی جس نے مجھے ان کی نقل و حرکت کی سخت محدودیت کے باعث سترہ سال تک گھر میں ان کے پہلو میں رہنے کا موقع فراہم کیا۔

اور ان یادوں میں سے جو میرے وجدان میں صبح کی شاخوں پر شبنم کی طرح نقش ہو گئیں، وہ یادیں تھیں جن میں میں اسکول جانے کی تیاری کے لیے صبح سویرے جاگتا تھا، تو میری ماں اکثر اوقات محبت کے ساتھ میرے لیے ناشتہ تیار کرتی تھیں۔

لیکن چند ہی دن ایسے ہوتے جب میں اپنے وقت سے پہلے جاگ جاتا، اور وہ سخت تھکن کی وجہ سے سو رہی ہوتیں۔ ان لمحات میں، میرے والد نرمی سے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے تاکہ میں اپنی والدہ نہ جگا دوں، پھر وہ خاموشی سے میرا ہاتھ پکڑ کر کچن میں لے جاتے، اور میرے لیے دہی اور کھجور پر مشتمل ایک سادہ سا ناشتہ تیار کرتے۔

وہ ایک کے بعد دوسری کھجور کھولتے، احتیاط سے اس میں سے گٹھلی نکالتے، پھر اسے دہی میں ڈبوتے اور مجھے پیش کرتے۔ اور وہ میرے پہلو میں اس وقت تک بیٹھے رہتے جب تک میں اپنا کھانا ختم نہ کر لیتا، پھر وہ مسکراتے ہوئے مجھ سے پوچھتے: ''کیا تم اب بھی بھوکے ہو؟''، اگر میں جواب میں ہاں کہتا، تو وہ دوبارہ وہی عمل دہراتے یہاں تک کہ میں سیر ہو جاتا۔

میرا واحد سوال جو بغیر جواب کے رہ گیا

اپنے والد کے ساتھ آخری ملاقاتوں میں سے ایک ملاقات میں، میں نے ان سے عمامے (عمامہ پہننے کی رسم) کے معاملے پر بات چیت کی۔

میں نے ان سے کہا جبکہ مجھ پر ان کو کھو دینے کا ایک خوف طاری تھا: ''مجھے عمامہ پہننے کی کوئی جلدی نہیں ہے، خواہ یہ اب ہو یا اسّی (۸۰) سال بعد۔۔۔ میرے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ مجھے عمامہ پہنائیں''۔

انہوں نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا، پھر میرے ذہن میں ایک خیال آیا تو میں نے کہا:

''لیکن میرے ذہن میں اس سے بھی زیادہ خوبصورت خیال آیا ہے! کسی دن، جب آپ رہبرِ معظم (امام آیت اللہ خامنہ ای رضوان اللہ علیہ) کے پاس جائیں، تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے جائیں، اور ان سے درخواست کریں کہ وہ آپ کی موجودگی میں مجھے عمامہ پہنائیں۔ کیونکہ میری یہ خواہش ہے کہ خود رہبرِ معظم مجھے عمامہ پہنائیں، لیکن اہم بات یہ ہے کہ آپ وہاں موجود ہوں''۔

تو انہوں نے مسکرا کر سر ہلایا جس سے اس خیال کے لیے ان کی پسندیدگی کا اظہار ہوتا تھا، لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا، جبکہ وہ ایسے تھے کہ کبھی کسی سوال کو بغیر جواب کے نہیں چھوڑتے تھے، وہ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے:

''ان شاءاللہ''، یا ''اگر اللہ نے ہمیں زندہ رکھا''، لیکن اس مرتبہ۔۔۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اٹھتی ہوئی محبت

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اپنے سینوں میں چھپے جذبات کا اظہار کرنے میں مہارت رکھتے ہیں، لیکن اُن کی شہادت سے پہلے کے اس دور میں، جو محبت میں ان کے لیے اپنے دل میں رکھتا تھا وہ اتنی بڑھ چکی تھی کہ خاموشی اسے اپنے اندر سما سکتی تھی اور نہ ہی سنجیدگی اسے چھپا سکتی تھی، میں انہیں اپنے ارد گرد ہر چیز میں دیکھتا تھا، اپنے دوستوں سے ان کے بارے میں ایسے فخر کے ساتھ باتیں کرتا تھا جو کبھی مدہم نہیں ہوتا تھا، ان کی تصویروں کو دیر تک ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہتا تھا۔۔۔ اور ان کے لیے شوق و تڑپ میں پگھل جاتا تھا، حالانکہ وہ ابھی تک ہمارے درمیان موجود تھے۔

میں ان کے سامنے اس اٹھتی ہوئی محبت کا اظہار کرتا تھا، بعض اوقات کسی واضح وجہ کے بغیر ہی انہیں فون کر دیتا تھا۔۔۔ صرف ان کی وہ آواز سننے کے لیے جو میری روح کو سکون دیتی تھی، تاکہ ان سے کہہ سکوں: ''ہمیں آپ کی بہت یاد آ رہی ہے''۔

تو وہ مجھے اپنے روایتی انداز میں جواب دیتے تھے: ''اس کی طرف سے جو اس سے بھی زیادہ مشتاق (ملنے کا خواہشمند) ہے''۔

اور میں اشتیاق کے ساتھ بات آگے بڑھاتا: ''بابا، میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں''۔

تو وہ کمالِ شفقت سے مجھے جواب دیتے: ''اور میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں میرے حبیب''۔

اور اس طرح میں محبت کے معاملے میں ان کے سامنے ایک چھوٹا بچہ تھا، میرے جذبات جتنے بھی بڑے ہوتے، وہ ان کے ہاتھوں میں آکر دوبارہ بچہ ہی بن جاتے تھے۔۔۔

زیارت کے بعد خیریت دریافت کرنا

مزاراتِ مقدسہ کی ہر زیارت کے بعد، میرے والد میرے واپس لوٹتے ہی فوراً مجھے فون کرتے تھے، تاکہ میری صحت کے بارے میں اطمینان حاصل کر سکیں، اور وہ مجھ سے زیارت کی تفصیلات اور اس ملک کے حالات کے بارے میں پوچھتے تھے جس کی میں نے زیارت کی ہوتی تھی۔

اور ہر مرتبہ، وہ اسی ایک انداز میں میرے ساتھ مذاق فرماتے تھے۔۔۔اگر میں کربلا سے واپس آتا، تو مجھے پکارتے: ''مہدی کربلائی''۔اور اگر میں مشہد سے واپس لوٹتا، تو مجھ سے فرماتے: ''مہدی مشہدی''۔

یہ سادہ سے الفاظ ہیں، لیکن یہ حافظے میں نقش ہو جاتے ہیں۔۔۔وہ ایک چھوٹے سے مذاق کو ایک بڑی یاد بنا دیتے ہیں، جو دل میں ہمیشہ تروتازہ رہتی ہے اور اسے کبھی نہیں چھوڑتی۔

خط کا وہ جملہ جسے چھپایا گیا تھا

معرکۂ 'اولی البأس' کے اختتام کے بعد، میں نے ایک ایسے خط کی تصویر شائع کی تھی جو میرے والد نے مجھے اس وقت لکھا تھا جب میں سولہ سال کا تھا، لیکن میں نے اس میں سے ایک جملہ چھپا دیا تھا؛ اس خوف سے کہ کہیں اسے اس کے اصل سیاق وسباق سے ہٹ کر نہ سمجھ لیا جائے، بغیر کسی ایسی وضاحت کے جو اس کی گہرائی کو بیان کر سکے۔

وہ جملہ اپنے اندر میرے بچپن کی ایک خاص یاد سمیٹے ہوئے تھا؛ وہ اپنے وقت میں سے قیمتی لمحات میرے ساتھ کھیلنے کے لیے وقف کیا کرتے تھے، اور بعض اوقات فٹبال میں مجھے مقابلے کی دعوت دیتے تھے، اور جان بوجھ کر ایسا کرتے تھے تاکہ وہ مجھے ان پر اپنی جیت کی خوشی منانے کا موقع دے سکیں وہ اپنی کثیر مصروفیات اور بھاری فکروں کے باوجود میرے لیے تفریح اور خوشی کا ایک ماحول پیدا کر دیتے

تھے۔اوراب میں آپ کے سامنے اس خط کا مکمل متن ظاہر کر رہا ہوں، جو کہ درج ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

میرے پیارے بیٹے، میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں، اور میں تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکتا، پس میں امید کرتا ہوں کہ تم مجھ سے اوجھل نہیں ہوگے، اور ہمیشہ میرے قریب رہوگے، اور میں یہ بھی امید کرتا ہوں کہ تم مقابلے میں میرے ساتھ صبر سے کام لوگے اور مجھے بری طرح شکست نہیں دوگے۔ میں اپنے پورے دل سے تم سے محبت کرتا ہوں، اے میرے پورے دل۔

تمہارا باپ

حسن

چنانچہ ''میرے ساتھ صبر سے کام لوگے'' اور ''مجھے بری طرح شکست نہیں دوگے'' سے مراد یہ تھی کہ میں فٹ بال میں ان پر جیت حاصل نہ کروں۔

تم میرے لیے ترجمہ کرو، میں تمہارے لیے ترجمہ کرتا ہوں

وہ بیٹھے ٹیلی ویژن دیکھ رہے تھے اور میں ان کے پہلو میں تھا، اس وقت میری عمر چودہ سال تھی۔

ایک نیوز چینل سامنے سے گزرا جو انگریزی زبان میں نشریات دکھا رہا تھا اور کوئی ایسا تبصرہ پیش کر رہا تھا جو اہم معلوم ہوتا تھا، تو وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''کیا تم انگریزی میں ہوشیار ہو؟''

میں نے اعتماد کے ساتھ انہیں جواب دیا: ''جی ہاں''۔

تو انہوں نے مسکراتے ہوئے فرمایا: ''تم مجھے ترجمہ کر کے بتاؤ کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں''۔

چنانچہ میں جتنا ہو سکتا تھا اپنی بساط کے مطابق انہیں وہ سب ترجمہ کر کے بتانے لگا جو کہا جا رہا تھا، پھر وہ اسی طرح چینلز بدلتے رہے، یہاں تک کہ وہ ایک چینل پر بغیر ترجمے کے فارسی زبان کی ایک فلم پر رک گئے۔

میں نے ان کی طرف دیکھا اور کہا: ''اب آپ کی باری ہے کہ آپ مجھے ترجمہ کر کے بتائیں!''

تو وہ ہنس پڑے، اور پھر وہ مجھے ترجمہ کر کے بتانے لگے جو کچھ وہ فلم میں کہہ رہے تھے۔۔۔

اُن کی مرضی پر سبقت لے جانے والے

میرے والد زیادہ مطالبہ کرنے والے نہیں تھے۔ بلکہ وہ فرمائش کرنے سے دور ترین اور اپنی ضروریات پر صبر کرنے میں سب سے آگے تھے۔ لیکن انہیں مانگنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی تھی، کیونکہ ہم ان کی خدمت کرنے سے محبت کرتے تھے۔۔۔اور ہم کمالِ اشتیاق کے ساتھ اس لمحے کا انتظار کرتے تھے۔

کھانے کی میز پر، جب ان کی پلیٹ خالی ہو جاتی، تو ہم ان کی آنکھوں کی طرف دیکھتے تھے۔ پس اگر ان کی نظریں کسی خاص ڈش پر ٹک جاتیں، تو ہم ان کی خدمت کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے؛ ہم میں سے کوئی پلیٹ لے آتا، اور دوسرا کھانا ڈالتا۔۔۔ ہم اس چیز کی طرف دیکھتے تھے جسے کرنا وہ پسند فرماتے تھے لیکن حالات (ایسا کرنے سے) روک دیتے تھے۔۔۔ چنانچہ ہم خود اسے پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

معرکۂ ''طوفان الاقصیٰ'' کے دوران اپنے خطابات میں سے ایک خطاب میں، انہوں نے فرمایا تھا کہ وہ ہر شہید کی برسی میں گفتگو کرنا، شہداء کے گھروں میں سے ہر گھر کا دورہ کرنا، اور ان کے خاندانوں کے ساتھ موجود رہنا پسند کرتے ہیں، جن کے لیے ان کی خاص محبت کا لمس ہم پوشیدہ اور اعلانیہ طور پر محسوس کرتے تھے۔

خطاب کے بعد، میں نے پہلے میسر موقع پر انہیں فون کیا، اور ان سے کہا:

''میں نے آپ کا خطاب سنا، اور یہ بھی کہ آپ شہداء کے گھروں کا دورہ کرنا پسند کرتے ہیں، تو آپ کا کیا خیال ہے کہ میں آپ کی نیابت میں ان کے پاس چلا جایا کروں؟''

تو انہوں نے اس بات سے اتفاق فرمایا، اور مجھے اس اقدام پر برکت کی دعا دی۔

ہدایت اور نصیحت کے بیان میں

رہنمائی

میرے والد ہمیں مکمل طور پر انتخاب کی آزادی دیتے تھے۔

لیکن ایک ایسا لمحہ آیا، جو کہ پہلی اور آخری مرتبہ تھا، کہ جس میں انہوں نے میرے انتخاب کو قبول نہ کرنے کا کھل کر اظہار کیا، اور اس کے باوجود انہوں نے اپنی رائے مجھے ماننے پر مجبور نہیں کیا۔

اور بہر حال، ہمارے لیے ان کی پسند کا ایک چھوٹا سا اشارہ ہی کافی ہوتا تھا کہ ہمارے ہاتھ اور پاؤں بغیر کسی حکم یا جبر کے اسے پورا کرنے کے لیے چل پڑتے تھے۔

وہ لمحہ حوزوی (دینی) تعلیم کے بارے میں ان کے ساتھ گفتگو کے دوران پیش آیا۔

اس وقت میں یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو چکا تھا، اور علمِ دین کے حصول کے لیے خود کو وقف کرنے کی خاطر قم مقدسہ منتقل ہونے کا خواہشمند تھا۔

لیکن انہوں نے مجھے تجویز دی کہ میں اسے بعد کے کسی مرحلے تک کے لیے مؤخر کر دوں، اور اس مرحلے کو لبنان ہی میں مکمل کروں، اور انہوں نے مجھے جنوب (جنوبی لبنان) منتقل ہونے کی نصیحت فرمائی، جہاں میں بیروت کے مقابلے میں حوزوی تعلیم کے لیے خود کو زیادہ بہتر طور پر وقف کر سکتا تھا۔

چنانچہ میں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے فوراً وہی کیا جس کا انہوں نے اشارہ فرمایا تھا۔

لیکن حیرت کا دھچکا اس وقت لگا جب انہوں نے مجھ سے پوچھا: ''تم کس شعبے (تخصص) میں اپنی تعلیم مکمل کرنا پسند کرو گے؟''

میں نے انہیں جواب دیا: ''فلاں شعبے میں''۔

تو پہلی مرتبہ ان کا جواب تھا: ''نہیں''۔

انہوں نے مجھ سے فرمایا: ''فقہ اور اصول کے شعبے میں (اپنی تعلیم) مکمل کرو''۔

اور انہوں نے مجھے وصیت فرمائی کہ میں ایک خاص علمی ہدف اپنی آنکھوں کے سامنے رکھوں، اور فلاں طریقے سے پڑھائی کروں، اور فلاں فلاں چیز پر توجہ مرکوز کروں۔

وہ نشست ایک جامع رہنمائی کی نشست کی طرح تھی، جس میں انہوں نے مجھے راستے پر ڈالا، اور جو کچھ وہ مجھ سے چاہتے تھے اس کے لیے ایک واضح لکیر کھینچ دی۔

اور پہلی مرتبہ، میرے والد نے، جو کبھی فرمائشیں کرنے والے نہیں تھے، مجھ سے کھل کر ایک چیز کا مطالبہ کیا، اور وہ حوزوی تعلیم کے لیے خود کو مکمل طور پر وقف کرنا تھا۔ اور یہی وہ چیز ہے جو حوزوی تعلیم اور علوم اہل بیت علیہم السلام کے ساتھ ان کی گہری دلچسپی کو ظاہر کرتی ہے۔

پڑھائی کا طریقہ

جب میں نے دینی علوم کی تحصیل شروع کرنے کا فیصلہ کیا، تو میں نے اپنی نشستوں میں سے ایک نشست میں اپنے والد سے پوچھا:

''پڑھائی کا سب سے بہترین طریقہ کار کیا ہے؟ اور آپ مجھے کس نصاب پر چلنے کی نصیحت فرماتے ہیں؟''

تو انہوں نے اپنے ذاتی تجربے کا ایک قصہ سناتے ہوئے مجھے جواب دیا، انہوں نے فرمایا:

''سال ۱۹۷۶ء میں، جب میں نجف اشرف گیا، تو شہید سید عباس موسوی علم دین کے طلبہ پر مشتمل ہمارے گروپ کے ذمہ دار تھے، اور وہ ایک استاد اور رہنما تھے''۔۔۔

گروپ کے ارکان کے درمیان پڑھائی کے طریقہ کار (نصاب) کو لے کر اختلاف ہو گیا کہ آیا وہ رائج روایتی طریقے پر چلیں یا اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ تلاش کریں؟

اور جب وہ کسی حتمی نتیجے پر نہ پہنچ سکے، تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ نجف میں مقیم اس وقت کے لبنانی مجتہدین میں سے ایک مجتہد کو اپنا حکم (فیصلہ کرنے والا) بنائیں، اور وہ عالی جناب شیخ حسن طراد رحمہ اللہ تھے۔

انہوں نے ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا، تو انہوں نے انہیں جواب دیا: ''میں نے روایتی طریقے سے پڑھائی کی ہے، اور اگر میں نے جو سال ضائع کیے ہیں ان پر ندامت کی وجہ سے اپنی انگلیاں چبا سکتا، تو میں ضرور ایسا کرتا''۔

پھر انہوں نے ان کے لیے اجتہاد تک پہنچنے کی خاطر علوم میں سے ہر علم کی ایک کافی مقدار کا تعین کرنا شروع کیا، چنانچہ وہ ان سے فرماتے تھے: ''نحو میں اتنا کافی ہے۔۔۔اور منطق میں اتنا کافی ہے۔۔۔اور بلاغت میں اتنا کافی ہے۔۔۔''۔

پس انہوں نے ان کے لیے راستہ آسان کر دیا اور سفر کو مختصر کر دیا۔

چنانچہ انہوں نے اسی بات کی پابندی کی جس کا انہوں نے اشارہ فرمایا تھا، اور انہوں نے ''آزاد پڑھائی'' کی، جیسا کہ اسے کہا جاتا ہے، جس میں وہ سال کے دوران صرف چند گنتی کے دنوں کے علاوہ کوئی چھٹی نہیں کرتے تھے، اس کے ساتھ ساتھ علم دین کے حصول کے لیے ان کا خود کو مکمل طور پر وقف کر دینا، ان کی انتہائی سنجیدگی، اور ان کی تعلیمی ترقی کی نگرانی کے لیے شہید سید عباس کی طرف سے خاص توجہ اور ان کا اساتذہ کا بڑی احتیاط سے انتخاب کرنا تھا۔۔۔ان سب چیزوں نے ایک مختصر سے عرصے میں ایک ممتاز علمی کامیابی کی راہ ہموار کی۔

اس بات کے گواہ کے طور پر، جب میں اپنے والد کے سامنے مقدمات (ابتدائی مراحل) کے مضامین میں سے کوئی سوال رکھتا تھا تو وہ فوراً مجھے جواب دیتے تھے اور اس کا معنی و مفہوم میرے لیے واضح کر دیتے تھے، حالانکہ انہوں نے تقریباً پچاس سال پہلے یہ سب پڑھا تھا۔

پھر انہوں نے مجھے پڑھائی کے طریقہ کار کا ایک اصول دیا، چنانچہ انہوں نے مجھ سے فرمایا: ''ہمیشہ ہر علم کو پڑھنے کے اصل مقصد کو حاصل کرنے پر توجہ مرکوز کرو۔

مثال کے طور پر اگر (کسی علم کا) مقصد ایک ہی کتاب سے حاصل ہو رہا ہو، تو صرف اس وجہ سے دو یا تین کتابیں پڑھنے میں اپنا وقت برباد نہ کرو کہ عام طور پر ایسا ہی رائج ہے۔ خاص طور پر مقدمات کے مرحلے میں، کیونکہ اس کے زیادہ تر علوم آلی (وسیلہ) ہیں جو دوسرے

علوم کے لیے پڑھے جاتے ہیں، بذاتِ خود اپنے لیے نہیں۔ یقیناً اچھے تعلیمی معیار کی شرط کے ساتھ۔ رہا وہ معاملہ جس میں حقیقی گہرائی اور وسعت کی ضرورت ہوتی ہے، تو اس کا حکم الگ ہے"۔

اور انہوں نے یہ واضح کیا کہ وہ آزادانہ طور پر پڑھائی کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن کچھ شرائط کے ساتھ، کیونکہ وہ جتنی فائدہ مند ہے، اگر اس کے ضوابط و قوانین کو نظرانداز کر دیا جائے تو وہ اتنی ہی خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔

پھر انہوں نے مجھ سے طلب کیا کہ میں کچھ طلبہ کو اکٹھا کروں تاکہ ہم ایک گروہ تشکیل دیں، اور وہ خود اس میں موجود رہیں گے بالکل ویسے ہی جیسے شہید سید عباس ان کے گروہ کے لیے تھے؛ چنانچہ وہ خود جدول طے کریں گے، بہترین اساتذہ کا انتخاب کریں گے اور ہماری تعلیمی ترقی کی نگرانی کریں گے۔

لیکن میں صرف دو نوجوانوں کو ہی اکٹھا کر سکا، یوں ہم صرف تین طلبہ رہ گئے۔ تب انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں حوزات میں سے کسی ایک حوزہ میں داخلہ لے لوں اور ان کے ساتھ اپنی پڑھائی جاری رکھوں، اور انہوں نے مجھ پر زور دیا کہ میں علم دین کے حصول کے لیے خود کو مکمل طور پر فارغ کروں اور کسی ایسے کام یا مصروفیت میں داخل نہ ہوں جو مجھے اس مقصد سے غافل کر دے۔

وہ نصیحتیں اور وہ الفاظ محض کوئی کہانی یا کوئی سرسری سی نصیحت نہیں تھے۔۔۔ بلکہ وہ میرے لیے ایک واضح شاہراہِ عمل (روڈ میپ) تھے۔

اولین مددگار

شعبان ۱۴۴۵ھ / ۲۰۲۴ء کے مہینے میں، اور ایک گہرے غور و فکر کے نتیجے میں، مجھے ایسا لگا کہ یہ وقت میرے لیے تبلیغ کی دنیا میں قدم رکھنے کے لیے موزوں ہو سکتا ہے۔

میں سوچ رہا تھا کہ سوشل میڈیا میں میری یونیورسٹی کی تعلیم اور حوزہ میں دینی علوم کی پڑھائی کا یہ ملاپ شاید کچھ فائدہ مند ثابت ہو، خواہ ایک محدود سطح پر ہی کیوں نہ ہو، تبلیغی ویڈیوز ریکارڈ کرنے کے ذریعے۔

اور یہ کہ اللہ نے، بغیر میرے کسی استحقاق کے، مجھے ایک ایسا نام عطا کیا ہے جس کا لوگوں کے دلوں پر اثر ہے، کیونکہ میں ایک ایسے

شخص کا بیٹا ہوں جس کی لوگوں پر اثر اندازی میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

یہ اثر اندازی میرے لیے محض ایک شرف نہیں ہے۔۔۔ بلکہ ایک ذمہ داری بھی ہے۔

میں نے (اس کے) پہلوؤں، خطرات اور ممکنہ تنقیدوں پر غور کیا۔۔۔ لیکن سوالات میرے ذہن میں گھومتے رہے:

وہ کون سی حقیقی وجہ ہو سکتی ہے جو مجھے تبلیغ کی نعمت سے روک دے؟ میں اللہ عزوجل کو کیا جواب دوں گا اگر اس نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ جو کچھ اس نے مجھے عطا کیا تھا میں نے اسے اس کی راہ میں کیوں استعمال نہیں کیا؟

چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ یہ معاملہ اپنے والد کے سامنے رکھوں، اور فیصلہ ان پر چھوڑ دوں۔ میں نے اپنے دل میں کہا: ''اگر انہوں نے کہا: ''ہاں''، تو یہ مجھ پر ایک ذمہ داری ہو گی، اور مجھے اسے اٹھانا ہو گا اور اگر انہوں نے کہا: ''نہیں''، تو میں نے اپنے آپ سے یہ بوجھ اتار دیا، اور مجھے ایک حجت مل گئی''۔

جب میں نے ان کے سامنے یہ خیال رکھا، تو انہوں نے مجھے کوئی براہِ راست جواب نہیں دیا، بلکہ پہلے انہوں نے مجھ سے ان ویڈیوز کے نمونے بھیجنے کا مطالبہ کیا جنہیں میں نشر کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

چنانچہ میں نے مختلف اسالیب اور موضوعات پر پانچ مختصر ویڈیوز تیار کیں، اور ان کے ساتھ ایک وضاحتی کاغذ بھی منسلک کیا جس میں میں نے ہر تفصیل کے انتخاب کی وجہ بیان کی تھی:

میرے گفتگو کا انداز، کیمرے کی طرف دیکھنا، علم دین کے طلبہ کا لباس پہننا۔۔۔

ان کا جائزہ لینے کے بعد، انہوں نے مجھے مزید بات چیت کرنے کے لیے 15 شعبان کو افطار کی ایک نشست پر بلایا۔

اس نشست میں، انہوں نے جو کچھ دیکھا تھا اس پر اپنی پسندیدگی اور خوشی کا اظہار کیا، اور مجھ سے کچھ سوالات پوچھے جیسے: ''تم مواد (کنٹینٹ) کیسے تیار کرتے ہو؟ اس میں تمہارا کتنا وقت لگتا ہے؟''۔۔۔

وہ مستند ذرائع کے بارے میں اطمینان حاصل کرنا چاہتے تھے، اور یہ کہ آیا یہ تبلیغ میری تعلیمی ترقی پر منفی اثر ڈالے گی یا نہیں۔ پھر انہوں نے اتفاق فرمایا اور مجھے اس اقدام پر برکت کی دعا دی، اور اپنی نصیحتوں اور ہدایات سے میری رہنمائی میں اضافہ کیا۔

اور تاکہ ان کا دل مزید مطمئن ہو جائے، میں نے خود پر کچھ پابندیاں عائد کر لیں، چنانچہ میں نے ان سے کہا کہ میں نشر کرنے سے پہلے مواد کی نظرِ ثانی اور نگرانی کے لیے حوزہ کے قابلِ اعتماد اساتذہ سے رجوع کروں گا، اور اگر میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ میری پڑھائی پر منفی اثر ڈال رہا ہے تو میں اسے فوراً روک دوں گا۔

لیکن واقعی حیران کن بات میرے لیے ان کی مستقل حمایت اور میرے لیے تبلیغ کو جاری رکھنے پر ان کا بار بار اصرار تھا۔ چنانچہ ایک سے زیادہ مرتبہ، میں نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ چاہتے ہیں کہ میں نشر کرنا بند کر دوں، خاص طور پر سننے والوں کا دائرہ وسیع ہو جانے کے بعد، اور کچھ قابلِ احترام علماء کی طرف سے ملاحظات اور تنقیدیں آنے کے بعد، جن کا خیال تھا کہ میں نے اس دنیا میں قدم رکھنے میں جلدی کی ہے۔ اور ان کا جواب ہمیشہ یہی ہوتا تھا: ''مت رکو۔۔۔ جاری رکھو، میں تمہارے ساتھ ہوں''۔ اور انہوں نے مجھ سے یہ بھی فرمایا: ''ہم اپنی پوری زندگی پڑھتے بھی رہے، اور ساتھ ہی ساتھ تبلیغ بھی کرتے رہے''۔

سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ محرم ۱۴۴۶ھ میں، تبلیغی ایام کی تیاری نے حوزہ کے امتحانات میں میرے نتائج کو متاثر کیا۔ تو میں نے ان کے پاس جا کر اسکا اعتراف کیا، اور ان سے کہا کہ میں اس کوتاہی کی وجہ سے (تبلیغی کام) روک دوں گا۔ تو انہوں نے مجھ سے فرمایا: ''مت رکو'' اور یہ کہ ایسی چیزیں ہو جاتی ہیں، خاص طور پر تبلیغی ایام کے دوران۔

پس وہی میرے سب سے پہلے مددگار تھے، اور وہی تھے جو میرے دل میں اطمینان پیدا کرتے تھے جب مجھے شکوک و شبہات گھیر لیتے تھے۔

وہ سب ایک ہی نور ہیں

میں اپنے والد میں تمام معصومین علیہم السلام کے لیے محبت دیکھتا تھا۔ جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا امیر المؤمنینؑ، یا سیدہ زہراؑ، یا امام حسنؑ، یا امام حسینؑ، یا امام صاحب الزمانؑ سلام اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں گفتگو کرتے، تو آپ ان کا عشق ان کی آنکھوں سے امڈتا ہوا دیکھتے۔

میں نے ایک مرتبہ ان سے پوچھا: ''بعض اوقات انسان کسی ایک امام کی طرف خاص میلان محسوس کرتا ہے، مثال کے طور پر امام حسینؑ یا امام مہدیؑ کے لیئے۔۔۔ کیا یہ کوئی ایسی کوتاہی شمار ہوتی ہے جو نہیں ہونی چاہیے؟ مجھے کس سے زیادہ محبت کرنی چاہیے؟''

توانہوں نے مجھے جواب دیا: ''کوئی مسئلہ نہیں ہے، پس جس امام کی طرف تمہارے جذبات کا میلان زیادہ ہو، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔۔۔ کیونکہ وہ سب ایک ہی نور ہیں''۔

مطالعے کا طریقہ

میں ایک ایسے عمومی مسئلے کا شکار تھا جو مطالعہ کے شوقین افراد کے درمیان عام ہے: میں کسی کتاب کو انتہائی جوش و خروش کے ساتھ شروع کرتا، پھر اسے مکمل نہیں کر پاتا تھا۔۔۔ بلکہ بعض اوقات تو میں ایک صفحے سے زیادہ پڑھنے کی استطاعت بھی نہیں رکھتا تھا، پس دن پر دن گزر جاتے اور میں اس کتاب کی طرف دوبارہ لوٹ کر نہیں جاتا تھا۔

میں نے اپنے والد سے اس کیفیت کے بارے میں پوچھا، توانہوں نے مجھے ایک خوبصورت عملی حل بتاتے ہوئے جواب دیا: ''یہ ضروری نہیں ہے کہ تم کتاب کو اس کے اول سے لے کر آخر تک پڑھو، بلکہ تم اس کی فہرست میں سے ان چیزوں کا انتخاب کر سکتے ہو جو تمہارے لیے مناسب ہوں، گویا کتاب ایک باغ ہے، پس تم اس میں سے جو پھول تمہیں پسند آئیں انہیں چن لو''۔

پھر انہوں نے ایک اور رہنمائی کا اضافہ فرمایا:

''ان موضوعات کا مطالعہ کرو جن کی طرف تمہارا نفس و دل مائل ہو، اور اسے ایسی چیز پڑھنے پر مجبور نہ کرو جو تمہیں راغب نہ کرتی ہو، تاکہ تم اکتا نہ جاؤ یا اصل مطالعہ ہی سے بیزار نہ ہو جاؤ''۔

اور انہوں نے ایک دانشمندانہ نصیحت پر بات ختم کی:

''تم ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ کتابوں کا مطالعہ کر سکتے ہو، پس جب تم ان میں سے کسی ایک سے اکتا جاؤ، تو دوسری کی طرف منتقل ہو جاؤ، یوں تم کتاب کو مکمل طور پر ترک نہیں کرو گے، بلکہ اس تبدیلی سے اپنی روح کو تازگی بخشو گے اور مستقل مطالعہ کی حالت میں رہو گے''۔

نماز میں بہتری

میں نے ایک دن اپنے والد سے سوال کیا: میں نماز میں اپنی توجہ (حضورِ قلب) کو کیسے بہتر بناؤں؟ تو انہوں نے مجھے قیمتی نصیحتوں کے ساتھ جواب دیا جو اب تک میرے حافظے میں نقش ہیں:

۱۔ نماز سے پہلے اپنے دل اور ذہن کو اللہ کے سوا ہر چیز سے خالی کر لو۔ اور انہوں نے میرے سامنے شہید سید محمد باقر الصدر کی مثال بیان کی، جو اذان سے پہلے اپنے مصلّے پر بیٹھ جایا کرتے تھے، اپنے ذہن کو ہر خیال سے خالی کرتے تھے تاکہ اپنے دل کو نماز کے لیے تیار کر سکیں، اور پھر نماز پڑھتے تھے۔

۲۔ جن کلمات کی تم تلاوت کرتے ہو، یعنی آیات اور اذکار، ان میں غور و فکر کرو اور ان سے تیزی سے نہ گزرو، بلکہ ان کے معانی کے ساتھ حاضرِ قلب رہو۔ اور تمہاری توجہ سورت کے آخر تک پہنچنے پر نہ ہو۔

۳۔ نمازِ جماعت نماز میں توجہ برقرار رکھنے میں مدد کرتی ہے۔

۴۔ نماز سے پہلے اذان اور اقامت پڑھا کرو؛ کیونکہ یہ دونوں نفس کو تیار کرتے ہیں اور اسے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے حضور کھڑے ہونے کے لیے آمادہ کرتے ہیں۔

۵۔ نماز کے اول وقت میں اس کی طرف پہل کیا کرو۔

۶۔ نماز کے اذکار، اس کی حرکات کے معانی اور اس بات میں غور و فکر کرو کہ تم کس کے لیے نماز پڑھ رہے ہو۔

میرے والد کی یہ وصیتیں میرے لیے ایک ایسی نماز کی طرف ایک شاہراہِ عمل تھیں جس میں دل خشوع اختیار کرتا ہے اور روح بلندی پاتی ہے۔

زبانوں پر توجہ دینا

صفر ۱۴۴۶ھ / ۲۰۲۴ء کے مہینے میں، میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ کیا وہ مجھے اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ میں عراق میں

اربعین کی مشی کے دوران غیر ملکیوں کے ایک گروپ کے سامنے انگریزی زبان میں ایک لیکچر پیش کروں؟

توانہوں نے اس بات سے اتفاق فرمایااور میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرمایا: ''انگریزی زبان پر اپنی گرفت برقرار رکھو اور اسے نظرانداز مت کرو، یہ ایک اہم امر ہے''۔

اور شوال ۱۴۴۴ھ/۲۰۲۳ء کے مہینے میں، ہمارے درمیان میرے قم مقدسہ منتقل ہونے کے بارے میں گفتگو ہوئی، توانہوں نے اسے مؤخر کر دیا، لیکن انہوں نے ایک اور بات پر بہت زور دیا: ''حتیٰ کہ اگر تم ابھی قم منتقل نہیں بھی ہو رہے، تب بھی فارسی زبان سیکھنے کو مؤخر مت کرو''۔

پھر انہوں نے مزید فرمایا:

''بہت سے دینی اور فکری خزانے اب بھی فارسی زبان میں ہیں، ان میں سے کچھ کا ابھی تک ترجمہ نہیں ہوا، اور کچھ کا ترجمہ ہوا ہے لیکن باریکی (درستگی) کے بغیر''۔

پھر انہوں نے ایک ایسے امر کی طرف اشارہ فرمایا جو ان کے دل کو بہت عزیز تھا:

''عالی جناب امام خامنہ ای رحمہ اللہ کے خطابات کو سننا اور انہیں براہِ راست سمجھنا، فارسی زبان سیکھنے کے لیے اکیلی یہی کافی وجہ ہے''۔

اور واقعی، ایک مختصر عرصے کے بعد، میں نے اسے سیکھنا شروع کر دیا۔

خاص درس

محرم سال ۱۴۴۶ھ/۲۰۲۴ء میں، اور عاشورہ کے چند دن بعد، میں جنوب (جنوبی لبنان) کے گاؤں میں سے ایک گاؤں میں درس دینے کی تیاری کر رہا تھا، تو میں نے اپنے والد سے درخواست کی کہ وہ مجھے کوئی ایسا موضوع تجویز فرمائیں جس پر میں گفتگو کروں، توانہوں نے مجھے نمازِ فجر تک انتظار کرنے کا اشارہ فرمایا۔۔۔

اور نماز کے بعد، میں نے انہیں فون کیا، تو انہوں نے مجھ سے فرمایا:

''درس کا محور یہ آیتِ کریمہ ہونا چاہیے: ﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ﴾ (اور جن لوگوں نے ہمارے لیے جدوجہد کی، ہم انہیں ضرور اپنے راستوں کی ہدایت کریں گے اور یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے)''۔

پھر انہوں نے وضاحت کرنا شروع کی:

''جہاد کی تعریفوں میں سے ایک تعریف، دشمن کے مقابلے میں اپنی پوری کوشش (طاقت) صرف کرنا ہے۔ اور جہاد صرف عسکری پہلو تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ دشمن کے مقابلے میں کی جانے والی کوئی بھی کوشش جہاد ہے: سیاسی، ثقافتی، ذرائع ابلاغ، تبیینی، اقتصادی، زرعی جہاد۔۔۔ اور دشمن صرف کوئی انسانی عنصر ہی نہیں ہے، جیسے امریکہ اور اسرائیل، بلکہ وہ شیطان، یا نفسِ امارہ بھی ہو سکتا ہے''۔

پھر انہوں نے مزید فرمایا:

''اس آیت میں ایک شرط ہے اور ایک نتیجہ، اگر شرط پوری ہو جائے، تو نتیجہ حاصل ہو جاتا ہے۔

شرط یہ ہے: ﴿جَاهَدُوا فِينَا﴾ یعنی یہ کہ ہمارا جہاد خالصتاً اللہ کے لیے ہو، کیونکہ جہاد تو اقتدار تک پہنچنے، مالِ غنیمت حاصل کرنے وغیرہ۔۔۔ کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔

اور نتیجہ یہ ہے: ﴿لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ ہماری ہدایت اور رہنمائی کی خود ذمہ داری لیتا ہے، اور وہ بھی کسی ایک راستے کی طرف نہیں، بلکہ متعدد راستوں کی طرف، کیونکہ اس نے فرمایا: ﴿سُبُلَنَا﴾۔۔۔ جمع کے صیغے کے ساتھ، اور یہ آیت تاکید کے ساتھ آئی ہے ﴿لَنَهْدِيَنَّهُمْ﴾ (ہم انہیں ضرور ہدایت کریں گے)۔۔۔ تو یہ الٰہی وعدہ کتنا بڑا اور کریمانہ ہے!''۔

اور انہوں نے اپنی اسی جانی پہچانی عاجزی کے ساتھ بات ختم کی:

''اصل مطلب یہی ہے۔۔۔رہا اس میں وسعت پیدا کرنا، تو وہ تمہارے ذمہ ہے''۔ (۱)

آخری دو مکالمے

اُن کی عمرِ شریف کے آخری ہفتوں میں، میرے اور ان کے درمیان آخری دو فون کالز ہوئیں۔۔۔ان میں سے ایک میں، میں نے 'نفسِ مطمئنہ' کے بارے میں پڑھنا شروع کیا تھا، تو میں نے ان سے اس کے بارے میں سوال کیا، اس تک پہنچنے کا راستہ جاننے کی خواہش کے ساتھ: ''کیا انسان واقعی اس درجے کو پا سکتا ہے؟''

تو انہوں نے وہاں تک پہنچے ہوئے شخص کے اعتماد کے ساتھ مجھے جواب دیا: ''ہاں۔۔۔بالکل''۔

پھر انہوں نے میرے سامنے اس کی وضاحت کرنا شروع کی گویا وہ کسی ایسی حالت کا نقشہ کھینچ رہے ہوں جسے وہ خود جی رہے ہیں، نہ کہ محض کوئی ایسی معلومات جو انہوں نے پڑھی ہو۔

اور دوسری گفتگو میں، بات چیت خوف اور امید کے موضوع گرد تھی، تو میں نے ان سے سوال کیا:

''انسان ان دونوں کے درمیان کیسے توازن قائم کرے؟''

تو انہوں نے فرمایا: ''مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ خوف اور امید کے ترازو کے دو پلڑوں کے درمیان زندگی گزارے۔ اگر وہ صرف اللہ کی رحمت کی طرف دیکھے گا، تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس کی تدبیر (پوشیدہ گرفت) سے بے خوف ہو جائے، خواہ اس کے اعمال صالح ہی کیوں نہ ہوں، کیونکہ وہ اپنے عمل کے انجام کو نہیں جانتا۔۔۔اور اگر وہ صرف اس کے عذاب کی طرف دیکھے گا، تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس کی رحمت سے مایوس ہو جائے، خواہ اس کے گناہ کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں، کیونکہ اللہ بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے''۔

امام صادقؑ سے روایت ہے: ''مومن مومن نہیں ہوتا یہاں تک کہ وہ خوفزدہ اور امیدوار ہو، اور وہ خوفزدہ اور امیدوار نہیں ہوتا یہاں تک کہ وہ اس چیز کے لیے عمل کرنے والا نہ بن جائے جس کا وہ خوف اور امید رکھتا ہے''۔ (۲)

---

(۱) سورہ العنکبوت، آیت ٦٩

(۲) الکافی، جلد ۲، صفحہ ۷۱

مبلغین کے لیے نصیحت

نشستوں میں سے ایک نشست میں، جب میں اُن سے تبلیغ کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا، تو انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ یہ بات اہم ہے کہ ایک مبلغ کو قرآنِ کریم، نہج البلاغہ اور صحیفہ سجادیہ کے کچھ حصے زبانی یاد ہونے چاہئیں۔۔۔

پھر انہوں نے بات یوں مکمل کی: ''اگر کوئی شخص پورا قرآن حفظ کرنے کی استطاعت رکھتا ہو، تو یقیناً یہ سب سے بہتر ہے، لیکن اگر وہ ایسا نہ کر سکے، جیسا کہ اکثریت کا حال ہے، تو اسے موضوعاتی طور پر (موضوع کے لحاظ سے) حفظ کرنا چاہیے''۔

میں نے ان سے پوچھا: ''وہ کیسے؟''

انہوں نے فرمایا: ''جہاد، شہادت، صبر، توبہ اور ہدایت (جیسے موضوعات) کی آیات کو یکجا کرنے اور انہیں حفظ کرنے کے ذریعے، کیونکہ یہ طریقہ تبلیغ میں زیادہ فائدہ مند اور افادیت کے زیادہ قریب ہے۔ اور اسی طرح نہج البلاغہ ہے، اس میں سے ان حصوں کو حفظ کرنا اہم ہے جن سے خطابات میں مدد لی جاتی ہے، خواہ اس کی عبارتیں مشکل ہی کیوں نہ ہوں، لیکن انہیں زبانی (یادداشت سے) پیش کرنا ایک خاص اثر چھوڑتا ہے''۔

پھر وہ مسکرائے اور انہوں نے مجھے ایک دلچسپ واقعہ سنایا:

''علماء میں سے ایک عالم نے ہمیں، یعنی مجھے اور طلبہ کے ایک گروپ کو جب ہم اپنی جوانی کے ابتدائی دور میں تھے، اس بات پر قائل کر لیا تھا کہ ہم روزانہ قرآن کا ایک صفحہ اور نہج البلاغہ کا ایک صفحہ پڑھیں، اور انہوں نے ہمیں اس بات پر بھی قائل کر لیا کہ ہم ایسا کرنے کی قسم کھائیں تاکہ خود کو اس کا پابند بنا سکیں۔

ہم نے ایک خاص مدت تک اس کی پابندی کی۔۔۔ لیکن یہ ایک مشکل کام اور بھاری بوجھ تھا، کیونکہ اگر ہم کسی بھی وجہ سے اس کی مخالفت کرتے (پورا نہ کر پاتے) تو گناہگار ہوتے، چنانچہ ہم میں سے ہر ایک نے اپنے والد سے رجوع کیا، کیونکہ ہم اس وقت امام خمینی قدس سرہ کی تقلید میں تھے تاکہ وہ ہماری قسم کو ختم کروا دیں، اور ہمارے ساتھ ایک شیخ (طالبِ علم) تھے جن کے والد اور دادا دونوں وفات پا چکے تھے، اس لیے وہ کچھ نہ کر سکے۔

میرا خیال ہے کہ وہ اب تک اس پر کاربند ہیں، اور شاید انہوں نے پورا قرآن اور نہج البلاغہ حفظ کر لیا ہو۔۔۔ لیکن حقیقت میں اس حفظ کی ایک عجیب برکت تھی''۔

میری تعلیمی کامیابی کے لیے ان کی تڑپ

جب سے میں حوزہ علمیہ میں داخل ہوا، میرے والد اس راہ کی تفصیلات سے غافل نہیں تھے جسے میں نے چنا تھا، بلکہ وہ اس میں موجود تھے۔۔۔ نہ صرف دعا اور حمایت کے ساتھ، بلکہ باریک بین اور ذاتی نگرانی کے ذریعے بھی۔

وہ کبھی مجھ سے فون پر اختصار کے ساتھ پوچھتے تھے:

''ہاں، پڑھائی میں کہاں تک پہنچے؟''

اور کبھی جب ہم ملتے، تو وہ تفصیلات میں جاتے:

''تم کون سے مضامین پڑھ رہے ہو؟ کس کتاب سے؟ تمہیں کون پڑھا رہا ہے؟''

اور میں بھی ان سے پڑھائی اور مطالعہ کے طریقہ کار کے بارے میں سوال کرتا تھا، اور ان سے ان بعض کتابوں کے نکات کے بارے میں دریافت کرتا تھا جنہیں انہوں نے عشروں پہلے پڑھا یا پڑھایا تھا، تو وہ مجھے جواب دیتے اور ان کی ایسے وضاحت کرتے تھے گویا انہوں نے اسے کل ہی پڑھا ہو، اور وہ ایسے شخص تھے جو اس دنیا سے کبھی الگ نہیں ہوئے جس سے وہ عشق کرتے تھے۔

لیکن انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔۔۔ بلکہ وہ حوزہ کے ذمہ داران سے بھی میرے بارے میں پوچھتے تھے۔

اور آخری سال میں، انہوں نے عالی جناب سید ہاشم صفی الدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہ سے، ان کے درمیان موجود دوستی اور بھائی چارے کے ناطے درخواست کی کہ وہ تعلیمی طور پر میری نگرانی کریں، چنانچہ وہ حوزہ کے ذمہ داران کے ساتھ اپنے معمول کے رابطے میں وقت فوقت میرے بارے میں پوچھتے رہتے تھے۔

اور میری دادی رحمھا اللہ کے تعزیت کے موقع پر میں نے ان سے مزاحاً کہا:

''سیدنا، ان شاءاللہ حوزے والے مجھ سے راضی ہیں؟''

تو وہ مسکرائے اور مجھ سے فرمایا: ''ہاں''، پھر اس کے بعد انہوں نے مجھے علمی نصیحتیں فرمائیں۔

اور میرے والد مجھے کچھ ایسی کتابیں بھیجتے تھے جن کا مطالعہ کرنا وہ اچھا سمجھتے تھے، اور مجھے نصیحت کرتے تھے کہ میں کچھ معروف علماء کے پاس بیٹھوں تاکہ ان سے فائدہ اٹھا سکوں، اور وہ وقت بہ وقت اس بات کی تصدیق بھی کرتے تھے کہ آیا میں واقعی ان کے پاس بیٹھا ہوں یا نہیں۔

اور وہ مجھے ان بعض افکار یا رجحانات سے خبردار کرتے تھے جن میں وہ کوئی انحراف دیکھتے تھے، اور میری رہنمائی اس چیز کی طرف کرتے تھے جو درست ہوتی تھی۔

غیر معمولی حافظہ

آخری پانچ سالوں میں، میری یہ کوشش ہوتی تھی کہ میرے والد کے ساتھ میری ملاقاتیں اور گفتگو صرف سرسری سلام دعا، احوال پرسی، یا ان کا چہرہ دیکھنے اور ان کی آواز سننے کے اس دائمی شوق کو عارضی طور پر پورا کرنے تک ہی محدود نہ رہیں۔

میں چاہتا تھا کہ وہ لمحات ایک علمی رنگ لیے ہوئے ہوں تاکہ میں ان کے وجود سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکوں۔

میں سوالات تیار کرتا اور ان کے سامنے رکھتا تھا۔

اور بعض اوقات، میرا مقصد محض جواب حاصل کرنا نہیں ہوتا تھا، بلکہ یہ سمجھنا ہوتا تھا کہ ان کے سوچنے کا انداز کیا ہے اور وہ موضوعات کو کس طرح حل کرتے ہیں۔

اور بعض اوقات تو میرے پاس سرے سے کوئی سوال ہوتا ہی نہیں تھا، چنانچہ میں صرف اس لیے مطالعہ اور تحقیق کرتا تھا تاکہ کوئی ایسا سوال پیدا کر سکوں جو ان کے سامنے رکھنے کے لائق ہو۔

ایک وقت میں، میں امام خمینی قدس سرہ کی کتاب 'الاربعون حدیثاً' (چھل حدیث) پڑھ رہا تھا، اور یہ وہی کتاب تھی جو انہوں نے

خود مجھے دی تھی اور مجھے اسے پڑھنے کا کہا تھا۔ امام کی حدیثِ اخلاص میں سے ایک حدیث میں، میں نے ایک بہت باریک گفتگو دیکھی، جہاں امام خمینی قدس سرہ نے مفہوم کے مطابق فرمایا تھا کہ اخلاص صرف اور صرف اللہ کا قرب حاصل کرنے کی نیت کا نام ہے جس میں کوئی دوسری چیز شامل نہ ہو، یہاں تک کہ جنت کا لالچ یا جہنم کا خوف، اگر ان میں سے کوئی بھی نیت میں داخل ہو جائے تو یہ قربِ الٰہی کی طلب کے ساتھ ذاتی مفاد کو شریک کرنا بن جاتا ہے، یوں عمل خالصتاً اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے نہیں رہتا۔

اس حصے کو پڑھنے کے بعد پہلی ہی فون کال میں، میں نے یہ موضوع اپنے والد کے سامنے رکھا اور ان سے مزاحاً کہا: ''امام خمینی نے تو ہمارے لیے اخلاص کو بہت مشکل بنا دیا ہے''۔

توانہوں نے فوراً مجھے جواب دیا:

''اگر تم اس سے اگلی عبارتیں پڑھتے، تو تم دیکھتے کہ امام خمینی یہ بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے لوگوں (کے اعمال) کو قبول فرمالیتا ہے۔۔۔ باوجود اس کے کہ اخلاص اعمال کی قبولیت کی شرط ہے''۔

اور جو کچھ انہوں نے فرمایا وہ بالکل درست تھا، کیونکہ میں وہ تفصیل پہلے اسی پیراگراف میں پڑھ چکا تھا، لیکن جس چیز نے مجھے واقعی حیران کیا وہ یہ تھی کہ یہ کتاب میرے والد نے عشروں پہلے پڑھی تھی۔۔۔

اور اپنی تمام تر ذمہ داریوں، کام کے دباؤ، اور روزمرہ ان کے سامنے آنے والی معلومات اور تفصیلات کی کثرت کے باوجود، انہیں اب تک اس طرح کی تفصیل اور وہ بھی اس حد تک باریکی کے ساتھ یاد تھی۔

یہ غیر معمولی حافظہ صرف میں نے ہی محسوس نہیں کیا تھا، بلکہ بہت سے علماء اور دیگر افراد نے بھی مجھ سے اس کا ذکر کیا تھا جب وہ سید رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کے بارے میں گفتگو کرتے تھے۔

جذبات کے بیان میں

لوگوں کی اُن سے محبت

تقریباً سال ۲۰۰۹ء کی بات ہے، میں ابھی چھوٹا بچہ ہی تھا، اور اپنے حواس سے یہ مشاہدہ کر رہا تھا کہ کس طرح سید عالیقدر کے لیے لوگوں کی محبت تیزی سے بڑھ رہی ہے، اور کیسے دن بہ دن اُن کا تعلق سید عالیقدر کے ساتھ گہرا ہوتا جا رہا ہے۔

اور ایک مرتبہ، میں نے فطری معصومیت سے ان کی طرف رخ کیا اور ان سے پوچھا:

''اللہ عزوجل آپ سے کتنی محبت کرتا ہے کہ اس نے لوگوں کو اس درجے پر، اور اس کیفیت و مقدار میں آپ سے محبت کرنے والا بنا دیا ہے؟''

ان کا جواب ایک آنسو تھا جو فوراً ان کی آنکھ سے ٹپک پڑا، جس کے بعد ایسے الفاظ آئے جو اپنے اندر وہ کچھ چھپائے ہوئے تھے جو آسانی سے نہیں کہا جا سکتا، فرمایا:

''اگر لوگ میرے اعمال کی حقیقت جان لیتے، تو مجھ سے کوئی بھی محبت نہ کرتا''۔

اس لمحے، میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ان کی مراد کیا ہے، یا وہ کون سے اعمال ہیں، جیسا کہ میں نے تصور کیا تھا، کہ اگر لوگ ان سے واقف ہو جاتے تو ان سے محبت نہ کرتے۔

لیکن جب میں بڑا ہوا، تو میں سمجھ گیا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ الفاظ کسی گناہ کی وجہ سے نہیں نکلے تھے، بلکہ انتہائی پاکیزگی اور ایک ایسے نفس سے نکلے تھے جو اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے اندر صرف کوتاہی ہی دیکھتا ہے۔

میں سمجھ گیا کہ جو کچھ انہوں نے فرمایا وہ محض تقویٰ، نفیِ ذات، اور اپنے نفس کی بھلائی کو کم سمجھنا تھا خواہ وہ کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو،

اوراس کے شر کو زیادہ سمجھنا تھاخواہ وہ کتناہی کم۔۔۔بلکہ خواہ وہ نہ ہونے کے برابر ہی کیوں نہ ہواور بالکل معدوم ہو۔

علمِ دین کے حصول سے ان کی محبت

اپنی بے پناہ مصروفیت کے باوجود، انہوں نے علمِ دین کے حصول سے، تدریس اور مطالعہ کرنے کی صورت میں، کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا، چنانچہ وہ آخر عمر تک بہت زیادہ اور مختلف عنوانات پر مطالعہ کرتے رہے، اور رہبر معظم امام خامنہ ای رحمہ اللہ کے دروسِ خارج کو سنتے رہے، نکات لکھتے رہے، اور تحقیق وتدقیق کرتے رہے۔۔۔اپنی زندگی کے آخری دنوں تک۔

اور علمِ دین کے حصول سے کبھی الگ نہ ہونے کے باوجود، ان کا دل اب بھی درس وتدریس کے لیے حقیقی معنوں میں وقف ہو جانے کا مشتاق تھا۔

ہمارے درمیان آخری نشستوں میں سے ایک نشست میں، انہوں نے مجھ سے فرمایا: ''کاش میں اور تمہاری والدہ کسی دور دراز جگہ پر، پہاڑ کے اوپر ایک چھوٹے سے گھر میں رہ سکتے، اور میرے ساتھ صرف کتابیں ہوتیں۔۔۔اور میں اپنا سارا وقت پڑھنے اور علم حاصل کرنے میں گزارتا''۔

میں اپنے ساتھ حوزاتِ علمیہ میں سے ایک حوزہ کا نصاب لے کر آیا تھاتاکہ اسے اُن کے سامنے پیش کروں، اوران سے درخواست کروں کہ وہ مجھے رہنمائی فرمائیں کہ میں حوزہ کے نصاب کے ساتھ ساتھ مزید کس چیز کا مطالعہ کر سکتاہوں، لیکن وہ اس سے پہلے ہی شہید ہوگئے کہ وہ میرے لیے وہ اضافی نصاب تیار کر پاتے۔

ہماری گفتگو کے دوران، میں نے ان سے کہاکہ حوزہ کا نصاب طویل ہے، اور 'بحثِ خارج' کے مرحلے تک پہنچنے سے پہلے یہ بہت وقت لیتاہے۔

توانہوں نے مجھے جواب دیا: ''کاش میرے پاس وقت ہوتا۔۔۔تو تم آتے اور میرے پاس بیٹھتے، اور میں تمہیں تمام مضامین خود پڑھاتا!''۔

پھر میں نے سوال کیا: ''اگر وہ آپ کو امامتِ عامہ (حزب اللہ کے سیکرٹری جنرل) کی ذمہ داری سے سبکدوش کر دیتے۔۔۔تو آپ

کیا کرتے؟''

تو وہ مسکرائے، اور انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ یہ ان کے لیے ایک بہت بڑی راحت ہوتی، اور وہ اس وقت جو کام کرتے وہ درس، تدریس اور مطالعہ کے لیے خود کو وقف کرنا ہوتا۔

عاشقِ ولایت

ایک سے زیادہ مواقع پر، میں نے امام خمینی قدس سرہ کے افکار اور ان کے نظریے کے لیے سید عالیقدر رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کے عشق کو واضح طور پر محسوس کیا۔

ایک مرتبہ میں نے ان کے سامنے امام خمینی سے متعلق ایک سوال رکھا، تو جواب دینے کے بعد انہوں نے مجھ سے فرمایا:

''امام خمینی دوپہر کے وقت چمکتے ہوئے سورج کی مانند ہیں۔۔۔ صرف اندھا ہی وہ شخص ہے جو اسے نہیں دیکھ پاتا''۔

وہ مجھے ہمیشہ ان کی کتابیں پڑھنے کی وصیت کرتے تھے، اور حوزہ میں میرے داخلے کے بعد پہلی کتاب جو انہوں نے مجھے تحفے میں دی، وہ امام خمینی کی کتاب 'الاربعون حدیثاً' (چہل حدیث) تھی۔

اور اُنہوں نے مجھ سے فرمایا: ''اسے پڑھو، اور اگر تمہیں کوئی بھی مسئلہ درپیش ہو۔۔۔ تو مجھ سے پوچھ لینا''۔

اور واقعی، میں اپنے سوالات لے کر ان کے پاس لوٹتا تھا، اور وہ مجھے جواب دیتے اور مطلب واضح کرتے تھے۔

اور میں نے ایک مرتبہ ان سے ایک خاص فلسفیانہ و عرفانی اصطلاح کے بارے میں پوچھا، جس کے بیس سے زیادہ معانی بنتے ہیں اور امام خمینی کبھی کبھار اپنی تحریروں میں اسے استعمال کرتے ہیں، باوجود اس کے کہ وہ اصطلاح ایسی شخصیات کے ہاں وارد ہوئی ہے جن پر کچھ اختلافات ہیں۔ تو انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ امام خمینی اس اصطلاح کو لیتے ہیں اور اس سے وہ معنی مراد لیتے ہیں جو خالص اور حقیقی اسلام کے سب سے زیادہ قریب ہو۔ اور وہ فرمایا کرتے تھے کہ امام خمینی ہی صحیح عرفان کی طرف جانے والا سیدھا راستہ ہیں۔

رہا امام خامنہ ای کے لیے ان کی محبت کا معاملہ، تو وہ ان کا ذکر کرتے وقت ان کی آنکھوں کی چمک سے ظاہر ہوتا تھا، اور ان کے لیے وہ

عبارت ہی کافی ہے جسے وہ خلوت اور جلوت میں دہرایا کرتے تھے، اور وہ ان کی سچی دعا تھی کہ اللہ ان کی بقیہ عمر لے لے اور اسے رہبر معظم کی عمر میں بڑھادے۔

اور خود رہبر معظم کی ان سے محبت کا یہ حال تھا کہ وہ سید عالیقدر سے ملاقات سے پہلے، ملاقات کے وقت اور اس کے بعد رہبر معظم امام خامنہ ای کی کیفیت سے واضح ہوتا تھا، چنانچہ امام خامنہ ای کے قریبی افراد نقل کرتے ہیں کہ وہ ان اوقات میں انتہائی شادمان اور مسرور ہوتے تھے، اور وہ سید عالیقدر کا استقبال تمام لوگوں سے ہٹ کر ایک منفرد اور خاص انداز میں کیا کرتے تھے۔

امام حسین علیہ السلام کی خدمت

محرم ۱۴۴۴ھ میں، میں نے اپنے والد کے سامنے ایک سوال رکھا:

کیا میں حسینیہ 'روضۃ الشہیدین' میں ایک مجلس کے بعد نوحہ پڑھ سکتا ہوں؟

میں نے انہیں بتایا کہ عزاداروں کی طرف سے نوحہ پڑھنے کی ویڈیو بنائی اور نشر کی جاسکتی ہے، اور یہ کہ میری آواز خوبصورت نہیں ہے اور شاید یہاں وہاں کوئی بات (تنقید) کی جائے۔۔۔ تو انہوں نے مجھے قبولیت کے ساتھ جواب دیا اور وہ ایک لمحے کے لیے بھی یہ پوچھنے کے لیے نہیں رکے کہ انداز کیسا ہوگا، آواز کیسی ہوگی یا ردِ عمل کیا ہوگا۔۔۔ انہوں نے بس جو کچھ دیکھا وہ یہ تھا کہ یہ خدمت امام حسینؑ کے لیے ہے۔

اور جو کچھ امام حسینؑ کے لیے ہو، اسے رد نہیں کیا جاتا۔ اور جب میں نے ان سے کہا کہ میں مجلسِ عزا کی خطابت سیکھنے کا پکا ارادہ رکھتا ہوں، تو وہ اس پر خوش ہوئے اور انہوں نے میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

میں ان کے ہاں ایک مستقل چیز کا مشاہدہ کرتا تھا: اس قسم کی کوئی بھی چیز جو امام حسینؑ سے مخصوص ہو، میں جب بھی اس کی درخواست کرتا۔۔۔ وہ بغیر کسی نفع نقصان کے حساب یا ہچکچاہٹ کے فوراً اس کی موافقت فرمادیتے۔ یہاں تک کہ اگر وہ معاملہ میرے لیے کسی ملامت یا تنقید کا باعث بھی بن سکتا ہو۔۔۔ جب تک وہ معاملہ امام حسینؑ کے راہ میں خدمت کے لیے تھا، تو اس سب میں کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

دوسرا حصہ

جو کچھ میں نے دیکھا

ایمان کے بیان میں

اُن کی عبادت کا احوال

اُن سب سے خوبصورت چیزوں میں سے، جن کا میں نے اپنی آنکھ سے مشاہدہ کیا اور اپنے دل سے تجربہ کیا، میرے والد کی سیرت کا وہ حصہ ہے جو مستحبات کے ساتھ ان کی شدید پابندی کا ہے، جو کہ اُن کے تقویٰ، اور احتیاط پر کاربند رہنے اور شکوک وشبہات کے مقامات سے بچنے کی ان کی تڑپ کے علاوہ تھا۔

وہ نمازِ شب کے مستقل پابند تھے، اسے کبھی نہیں چھوڑتے تھے، چنانچہ میں نے انہیں راتوں میں سے کسی ایک رات بھی ایسا نہیں دیکھا کہ انہوں نے اِسے ترک کیا ہو یا کبھی اِس سے غافل ہوئے ہوں۔

اور وہ اپنی نماز کا آغاز اس کے اول وقت میں کرتے تھے، جس کے بعد وہ تعقیبات، دعاؤں اور نوافل کی ادائیگی کرتے تھے۔

اور مستحبات ان کے روزمرہ کے معمولات کا ایک بنیادی حصہ تھے، باوجود ان کی بے پناہ مصروفیت اور وقت کی تنگی کے۔

بلکہ ان اعمال میں سے بعض وہ عمل، جنہیں لوگ مصروفیات کے ساتھ پانا ناممکن یا مشقت آمیز سمجھتے ہیں، وہ انہیں مستقل مزاجی اور پکے ارادے کے ساتھ ادا کرتے تھے، یہاں تک کہ اپنی نیند کی کمی اور اپنی ذمہ داریوں کی کثرت کے باوجود بھی انکی پابندی کرتے تھے۔

قرآن سے عشق

وہ آیات یا احادیث سے بہت زیادہ استدلال پیش نہیں کرتے تھے، لیکن وہ اپنے سلوک اور عمل میں انہیں جی رہے ہوتے تھے، چنانچہ ان کا ہر لفظ اور ان کی ہر حرکت قرآن اور سنت کا ہی ایک تسلسل ہوتی تھی۔

ان کی سوچ، ان کا طرزِ عمل اور ان کی زندگی قرآنی بنیادوں پر قائم تھی، بغیر اس کے کہ وہ اس کا اعلان کرنے میں کسی تکلف سے کام

لیں۔

اور کس قدر زیادہ ہم ان کی گفتگو میں قرآن کی روح کو محسوس کرتے تھے، یا ان کے کلمات میں نبوت کی خوشبو سونگھتے تھے۔ پس اکثر ہم یہ پاتے تھے کہ ان کی عادات واطوار دراصل قرآنی مفاہیم کی عکاسی کرتی ہیں یا نبوی روح کے ساتھ دھڑکتی ہیں۔

بغیر نقش کے انگوٹھی

میرے والد اپنی انگوٹھیاں ہر اس شخص کو دے دیا کرتے تھے جو ان کی فرمائش کرتا، وہ اس کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں خوشی پیدا کرتے اور انہیں اس کے ثواب میں اپنے ساتھ شریک کرتے تھے۔

اور جب وہ اپنی بغیر کسی نقش والی انگوٹھیاں تقسیم کرنے لگے، تو بعض لوگوں کو اس تبدیلی پر تعجب ہوا۔

لیکن اس کی وجہ بعد میں ظاہر ہوئی، کیونکہ وہ اس بات سے ڈرتے تھے کہ انگوٹھی پر کوئی مقدس لفظ یا قرآنی آیت لکھی ہو، اور پھر اسے کوئی ایسا شخص چھولے جو مستقل باوضو نہ رہتا ہو، اور یوں وہ گناہگار ہو جائے۔

وہ صرف زبانی نصیحت کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ انگوٹھی کے نقش کو چھونے جیسی تفصیل میں بھی احتیاط برتتے تھے، اس خوف سے کہ کہیں وہ حرام میں نہ پڑ جائیں۔ یہ وہی پوشیدہ رحمت ہے، جس کی طرف صرف وہی شخص توجہ کر سکتا ہے جس نے انہیں قریب سے جانا ہو۔

قرآن، مجلسِ عزا اور نوحہ

وہ قرآنِ کریم کو سننے میں ایک خاص لذت محسوس کرتے تھے، اور ان کی روح اس کی تلاوت سے مانوس ہوتی تھی، خاص طور پر جب آواز پر درد اور شیریں ہو جیسے مثال کے طور پر قاری مصطفیٰ اسماعیل کی تلاوت۔ اسی طرح وہ اہل بیت علیہم السلام سے محبت رکھنے والے بعض قراء کو سننے کو ترجیح دیتے تھے۔

اور مجلسِ عزا کے لیے ان کی محبت قرآن کے لیے ان کی محبت سے کسی طرح کم نہ تھی، چنانچہ وہ امام حسینؑ کے مصائب کے ساتھ

پورے وجد اور شوق کے ساتھ جیتے تھے، اور محبت وولاء کے اظہار میں ان کے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔

اور وہ پرانے نوحوں میں، خصوصاً جہادی نوحوں میں جو شہداء کے بارے میں ہوتے تھے، اپنے نفس پر ایک خاص اثر پاتے تھے، خاص طور پر جب ان کے ساتھ شہداء کے نورانی چہروں کی ویڈیو کلپس بھی شامل ہوں، تو وہ اس سے انتہائی گہرا اثر لیتے تھے۔

تنہائی میں ان کا گریہ کرنا

اکثر میں ٹیلی ویژن یا ریڈیو سے دعاؤں کی گونجتی ہوئی آواز سنا کرتا تھا۔۔۔ تو میں انہیں پاتا کہ وہ بیٹھک میں پناہ لیے ہوئے دعا میں یا اسے سننے میں مشغول ہیں، اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔

میں نے انہیں کسی بھی دن اس حالت میں نہیں دیکھا مگر اس طور پر کہ وہ خشوع اور تاثر کے بلند ترین مرتبوں پر ہوتے تھے، گویا دنیا ان کے سامنے سے غائب ہو چکی ہو، اور ان کی آنکھوں میں اللہ عزوجل کے سوا کچھ باقی نہ رہا ہو۔

اور ان لمحات میں ان کا رعب و جلال مجھے انکے قریب جانے یا ان کے خشوع کو توڑنے سے روک دیتا تھا، کیونکہ وہ ایسے ملکوتی لمحات ہوتے تھے جن کا کوئی موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔

اللہ کے ساتھ تجارت

سید عالیقدر نے اپنی پوری عمر اللہ کے ساتھ تجارت کرتے ہوئے گزاری، انہوں نے دنیا کی حقیقت کو پہچان لیا تھا اس لیے اس کی زینتوں سے کنارہ کشی اختیار کی، اور اسے تین بار طلاق دے دی، اور ایمان سے آباد دل کے ساتھ آخرت کی طرف متوجہ ہو گئے۔

زہد ان کے ہاں محض زبانی کلام نہیں تھا، بلکہ ایک زندہ عمل تھا، وہ بغیر کسی غرض کے عطا کیا کرتے تھے، صدقہ کرتے تھے، اور بخش دیا کرتے تھے، اور وہ بڑی توجہ کے ساتھ ان مستحقین کا انتخاب کرتے تھے جو عطا کے حقدار ہوتے تھے۔

ہم نے کتنی ہی بار انہیں وہ تحائف تقسیم کرتے ہوئے دیکھا جو انہیں حاصل ہوتے تھے، گویا وہ اپنے نفس کے لیے کچھ بھی نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ انہوں نے اپنی اس سب سے بڑی تجارت کا اختتام اپنی سب سے قیمتی ملکیت دے کر کیا، چنانچہ انہوں نے اپنی روح کو

اللہ کے حضور قربان کر دیا، اور اس کے ذریعے انہوں نے بہت بڑی کامیابی پالی۔

سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے

خلوت اور جلوت کے تمام پہلوؤں میں، ان کی زندگی ہمیشہ اللہ پر خالص توکل کے ساتھ آراستہ رہتی تھی، اور ہر موقع پر وہ اس بات کی تاکید فرماتے تھے کہ ہم جس حال میں بھی ہیں اور ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے، وہ صرف اور صرف اللہ ہی کی عطا ہے، نہ کہ ہمارے اپنے اختیار یا طاقت سے، اور نہ ہی اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہے۔ پس توفیق، ہدایت اور نصرت۔۔۔ یہ سب الٰہی نعمتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مشیت سے صادر ہوتی ہیں۔

اُن کے کلمات شکر، دعا اور خالق سے مدد مانگنے، اور فضل کو اس کے نازل کرنے والے کی طرف لوٹانے سے بھرے ہوتے تھے، وہ اِس خالص توحید پر اپنے قریبیوں اور دور والوں سب کی تربیت کرتے تھے۔

چنانچہ وہ اپنے رب پر پورا بھروسہ رکھنے والے کے اعتماد کے ساتھ فرماتے تھے: ''اللہ ہی ہے جو کرتا ہے، اللہ ہی ہے جو رہنمائی فرماتا ہے، اللہ ہی ہے جو توفیق دیتا ہے''۔

پس کوئی بھی نعمت، کوئی بھی حرکت اور کوئی بھی اثر ایسا نہیں ہے۔۔۔ مگر یہ کہ وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے، اور ہماری اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں ہے۔

قرآن کے ساتھ اُن کا تعلق

وہ کتاب جو کسی بھی دن ان سے جدا نہیں ہوئی، قرآنِ کریم ان کے سفر کا ساتھی تھا۔ آپ انہیں ہمیشہ، رات اور دن، اسے اپنے ہاتھوں میں لیے ہوئے دیکھتے، وہ اسے سکون سے پڑھتے، تدبر کے ساتھ اس میں غور و فکر کرتے، اور اس سے حکمت حاصل کرتے تھے۔

قرآن ان کی زندگی کا روشن چراغ تھا، وہ اس سے اپنے افکار اور رجحانات اخذ کرتے تھے، اور اپنے مؤقف اور طرزِ عمل میں اسی پر تکیہ کرتے تھے۔

قرآن کے ساتھ ان کا تعلق محض تلاوت تک محدود نہیں تھا، بلکہ یہ ایک زندہ دستورِ حیات تھا جس کے ساتھ وہ چلتے تھے، اس کے احکام کے ساتھ کلام کرتے تھے، اور اگر اس کی حرمت پامال کی جاتی تو اللہ کے لیے غضبناک ہو جاتے تھے۔

اور ہم اُنکی اس غیور اور غضبناک ایستادگی کو نہیں بھول سکتے، جب کچھ نادانوں نے مصحفِ شریف کو جلانے کی کوشش کی، تو انہوں نے اپنی گرجدار آواز میں شعار بلند کیا اور فرمایا:

''اس مصحف کی ہم اپنی روحوں سے حفاظت کریں گے، ہم اپنے دلوں سے اس کی حفاظت کریں گے، ہم اپنے خون سے اس کی حفاظت کریں گے، ہم اپنے جگر کے ٹکڑوں سے اس کی حفاظت کریں گے''۔

اور وہ ہمیں ہمیشہ یہ وصیت فرماتے تھے کہ ہم اپنے گھروں میں موجود قرآن کریم کے تمام نسخوں کی تلاوت کیا کریں تاکہ ان پر دھول نہ جمے۔

اُن کی پوشیدہ سخاوت

ان کی شہادت سے پہلے، ہم ان کی بعض متفرق امداد اور صدقات کے بارے میں جانتے تھے، مگر ان سے براہِ راست نہیں، بلکہ دوسروں کے ذریعے اور اتفاقیہ طور پر ہمیں پتا چلتا تھا۔

لیکن ان کی شہادت کے بعد، ہم اس مقدار کو دیکھ کر حیران رہ گئے جسے وہ چھپا کر رکھتے تھے۔ کتنے ہی پوشیدہ صدقات ایسے تھے جن کے بارے میں ہم کچھ بھی نہیں جانتے تھے!

میں ان میں سے صرف کچھ عنوانات کا ہی ذکر کروں گا: کھانا کھلانا، مالی امداد، یتیموں کی کفالت...

اور وہ اس بات کے شدید خواہش مند ہوتے تھے کہ اس عطا کی نسبت ان کی طرف نہ کی جائے، یا یہ نہ معلوم ہو کہ یہ ان کی طرف سے ہے، اور وہ اس شخص کی عزتِ نفس کی حفاظت کرنے کے زیادہ حریص ہوتے تھے جسے وہ دیتے تھے، چنانچہ وہ اسے، نہ قریب سے اور نہ دور سے یہ احساس تک نہ ہونے دیتے کہ وہ اس پر احسان کر رہے ہیں۔

ان کی عطا کسی ایک گروہ، مذہب یا علاقے تک محدود نہیں تھی، بلکہ اس میں سب شامل تھے۔

اور وہ صدقۂ جاریہ کو خاص اہمیت دیتے تھے: مساجد کی تعمیر، نفع بخش کتابوں کی تقسیم، اور دیگر مستقل خیر کے کام۔

ان کی عطاان کے اور اللہ کے درمیان ایک راز تھی، لیکن شاید اللہ نے ان کے رخصت ہو جانے کے بعد اس کا کچھ حصہ ظاہر کر دیا تاکہ یہ ان کی سخاوت اور خیر کے لیے ان کی سچی محبت کا گواہ بن سکے۔

ی: موت کو یاد رکھنے والے

میرے والد خلوت اور جلوت میں ہمیشہ موت کو یاد رکھنے والے اور ہمیشہ اس کی یاد دہانی کرانے والے تھے۔ اور اکثر اوقات، میں انہیں یہ آیاتِ کریمہ دہراتے ہوئے سنتا تھا:

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾ (۱)

ان کی زندگی میں موت کا ذکر کوئی سرسری چیز نہیں تھا، بلکہ یہ ایک ایسا ترازو تھا جس سے وہ ہر چیز کو تولتے تھے۔

آخرت ہی ان کے حساب کتاب کا محور تھی، چنانچہ کسی عمل کو کرنے یا اسے چھوڑنے کا معیار صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا تھی۔ وہ بار بار دہراتے تھے کہ ہمیں سوال و جواب کے دن کے لیے جوابات تیار کرنے چاہئیں، کیونکہ اللہ ہر چیز پر گواہ ہے، اور وہ ہم سے ہر چھوٹی اور بڑی چیز کے بارے میں سوال کرے گا۔

میرے والد رضوان اللہ تعالیٰ علیہ اپنے منہ سے نکالے جانے والے ہر لفظ میں، اور اپنے اختیار کیے جانے والے ہر طرزِ عمل یا فیصلے میں قبر، برزخ اور قیامت کی بازپرس کو زیرِ نظر رکھتے تھے۔۔۔ انہوں نے دنیا میں آخرت کی آنکھ سے زندگی گزاری۔۔۔

ماہِ رمضان

میرے والد ماہِ رمضان المبارک کی آمد پر بہت زیادہ خوش ہوتے تھے، اور اپنے دل، عمل اور طرزِ عمل میں اسے ایک منفرد مقام دیتے تھے، کیونکہ اِس میں برکات اور رحمت کی ہوائیں ہوتی ہیں، اور اس لیے کہ یہ اللہ عزوجل کی ضیافت کا مہینہ ہے، عبادات کے دگنے

(۱) سورۂ رحمن، آیات ۲۶ اور ۲۷

ہونے، دلوں کی پاکیزگی اور شیاطین کے جکڑے جانے کا مہینہ ہے۔

اس بابرکت مہینے میں ان کی گفتگو کا محور صرف اور صرف 'دین' ہوتا تھا، نہ کہ سیاست یا دنیا کی مصروفیات۔ پس یہ تبلیغی اوقات ایک ایسا موقع ہوتا تھا جس میں وہ ان موضوعات پر بات کرتے تھے جن کے بارے میں وہ گفتگو کرنا سب سے زیادہ پسند کرتے تھے، اور ان کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کرتے تھے، اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے قریب کرتے تھے۔

وہ اس مہینے میں اپنی عبادت بڑھا دیتے تھے، اور اپنے آس پاس والوں کو قرآن پڑھنے اور اس قیمتی وقت سے فائدہ اٹھانے کی تاکید کرتے تھے، اور وہ خود ایسے تھے جو لوگوں کو ہمیشہ اور خاص طور پر اس بابرکت مہینے میں مساجد کا رخ کرنے اور ان میں اس ماہِ مبارک کی راتوں کا احیاء کرنے کی ترغیب دیتے تھے، وہ اس بات کی تاکید فرماتے تھے کہ روزہ صرف کھانے پینے سے رُکنے کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ ایک روحانی تصوف اور دل کی پاکیزگی ہے۔

اور ہمارے لیے، یعنی ہم اہل خانہ کے لیے سالانہ ایک مستقل وقت طے تھا جو کبھی نہیں بدلتا تھا: اس بابرکت مہینے میں ان کے ساتھ افطار کرنا، چنانچہ اس میں ان کے ساتھ ہماری ملاقات نور علیٰ نور ہوتی تھی۔

وہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہ مہربانی اور آدابِ ضیافت کی ایک اعلیٰ اور نفیس مثال تھے۔

اگر وہ کہیں مہمان ہوتے، تو افطار سے پہلے صرف نمازِ مغرب پر ہی اکتفا کرتے؛ تاکہ اپنے میزبانوں کو کسی الجھن میں نہ ڈالیں یا دن بھر کے روزے کے بعد انہیں کھانا کھانے میں دیر نہ کروائیں۔

اور اگر وہ خود میزبان ہوتے، تو کھانے سے پہلے مغرب اور عشاء کی نمازیں ایک ساتھ پڑھاتے، پھر اپنے مخصوص لطف و کرم کے ساتھ مزاحاً فرماتے: ''مجھے اجازت دیں، اس مرتبہ آپ میرے مہمان ہیں، اور آپ کو میرے قوانین کی پابندی کرنی ہوگی''۔ چنانچہ ہم پہلے ان کے ساتھ نماز پڑھتے، پھر افطار کے دستر خوان کے گرد جمع ہو جاتے۔

یہاں تک کہ کھانا کھانے کے دوران بھی وہ ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں کے جذبات کا خیال رکھتے تھے، چنانچہ وہ جلدی کھانا بند نہیں کرتے تھے تاکہ کوئی شرمندگی محسوس نہ کرے، بلکہ وہ ٹھہر ٹھہر کر کھاتے تھے، اور سلسلہ جاری رکھتے تھے خواہ تھوڑا ہی کیوں نہ کھا رہے ہوں، یہاں تک کہ سب لوگ راحت محسوس کر لیتے۔

غیب پر ایمان

میرے والد غیب پر سچا اور حقیقی ایمان رکھتے تھے، اور یہ متقین کی وہ پہلی صفت ہے جس سے اللہ نے سورۂ بقرہ مبارکہ کا آغاز فرمایا ہے:

﴿ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ * الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ...﴾[1]

ان کا ایمان محض ایک نظریہ یا کوئی سرسری قناعت نہیں تھا، بلکہ ان کے کہے ہوئے ہر لفظ میں، ان کے ہر مؤقف میں، اور ان کی زندگی میں رواں ہر حرکت میں ایک زندہ اور دھڑکتی ہوئی حقیقت تھا۔۔۔ وہ ہمیشہ یہ دیکھتے تھے کہ حقیقی طاقت صرف اللہ کی طاقت ہے، اور وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے، اور وہی ہے جس نے اپنی کتاب میں ہم سے وعدہ فرمایا ہے: ﴿إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ﴾ (اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو وہ تمہاری مدد کرے گا)۔

انہیں اس بات کا یقینِ کامل تھا کہ اللہ کے وہ لشکر جنہیں ہم نہیں جانتے، اللہ انہیں اپنے مومن بندوں کی نصرت کے لیے مسخر فرما دیتا ہے، اور یہ کہ زمین، آسمان، درخت اور جمادات میں سے جو کچھ بھی اللہ کی عبادت کرتا ہے۔۔۔ وہ اس کے دشمنوں کے خلاف لڑنے والے اس کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہو سکتا ہے۔

وہ ایک مستقل قاعدے پر ہماری تربیت کرتے تھے کہ ہمیں اسباب کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔۔۔ اور نتائج کے معاملے میں اللہ پر توکل کرنا چاہیے۔ اور نتائج خواہ کچھ بھی ہوں، وہ ایک نعمت ہیں، ہم ان پر راضی رہتے ہیں اور ان پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

اور غیب پر ان کے ایمان کا مطلب خوابوں پر تکیہ کرنا نہیں تھا، جیسا کہ بعض لوگ گمان کر سکتے ہیں، ہاں وہ کبھی کبھار ان سے اچھا شگون ضرور لیتے تھے، لیکن وہ ان پر کسی چیز کی بنیاد نہیں رکھتے تھے، اور نہ ہی کوئی فیصلہ لینے کے لیے خوابوں پر انحصار کرتے تھے، کیونکہ خواب ان چیزوں میں سے نہیں ہیں جن پر اس معاملے میں بنیاد رکھی جائے۔

---

(١) سورۂ بقرہ، آیات ٢ اور ٣

اخلاق کے بیان میں

لوگوں کے لیے اُن کی محبت

سید عالیقدر اور لوگوں کے درمیان محبت کوئی ایک طرفہ راہ نہیں تھی، بلکہ یہ جذبوں کا ایک مضبوط پُل تھا جس پر اُن کے اور لوگوں کے آنسو رواں رہتے تھے، اور جس پر اُن کے اور لوگوں کے کلمات ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے تھے۔

ہم دونوں طرف سے اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے، اپنے کانوں سے سنتے تھے اور اپنی روحوں سے محسوس کرتے تھے۔

ان کی اپنی طرف سے: ہم لوگوں کا ذکر آنے پر ان کے کلمات کو فرطِ جذبات سے لبریز ہوئے سنتے تھے، اور اس وفادار قوم کے لیے اُن کے گہرے شکر گزار ہونے اور ان پر ان کی شفقت کے گواہ بنتے تھے، اور ان کا تپش سے بھرپور دفاع، ان پر ان کا راسخ اعتماد اور ان کی وفاداری پر ان کا مستقل شکر سنتے تھے۔

اور ہم دیکھتے تھے کہ جب ان تک کسی کی طرف سے کوئی محبت آمیز خط پہنچتا، یا ان تک لوگوں کی قربانیوں کی خبر پہنچتی، یا وہ ٹیلیویژن کی اسکرین پر اپنی آنکھوں سے لوگوں کے فداکارانہ مناظر دیکھتے، یا ریلیوں میں ان گہرے روحانی لمحات کا مشاہدہ کرتے، تو وہ شدید تاثر سے مغلوب ہو جاتے۔

وہ لوگوں کے دُکھ درد کو اپنے کندھوں پر اٹھائے رکھتے تھے، اور اُنہیں اپنی ترجیحات میں سب سے اوپر رکھتے تھے۔

اور دوسری طرف سے: ہم لوگوں کے جذبات کو اُن کے لیے محبت کی شکل میں امڈتے ہوئے دیکھتے اور سنتے تھے، ان کے سچے کلمات، ان کے مشتاق آنسو اور اپنی محبت کا اظہار کرنے پر ان کا مستقل اصرار۔

امام حسینؑ کے اربعین پر عراق کے میرے سفر کے دوران، میری ملاقات ایسے لوگوں سے ہوئی جو دور دراز مشرق اور بعید ترین مغرب کے علاقوں سے آئے تھے، وہ مجھے پورے خلوص اور اشتیاق سے روکتے تھے اور درخواست کرتے تھے کہ میں ان کا سلام ان سید عالیقدر تک پہنچادوں؛ ایسا سلام جو ان کے دلوں سے ایسے ابل رہا ہوتا تھا جیسے ان کی آنکھوں سے آنسو ابلتے ہیں۔

میں نے ان کی آنکھوں میں رونا دیکھا جب سید عالیقدر کا نام لیا جاتا، اور ان کے بارے میں بات کرتے وقت یا ان کی لوگوں کے بارے میں گفتگو کے وقت میں نے ان کی آوازوں میں سسکیاں سنیں۔ اور میں جنازے (تشییع) کے آنسوؤں، ملاقات کے آنسوؤں اور جدائی کے آنسوؤں کا گواہ رہا، اور یہ سب محبت کے ایک ہی دریا میں بہہ رہے تھے۔ یہ سب کچھ صرف اس لیے۔۔۔ کیونکہ وہ ''سید حسن'' تھے۔

یہ تعلق کوئی سرسری سیاسی تعلق نہیں ہے، اور نہ ہی کوئی عارضی یا وقتی معاملہ ہے، بلکہ یہ روحوں میں جڑ پکڑا ہوا ایک ایسا رشتہ ہے جسے نہ تو دیواروں سے تصویریں مٹانے سے اکھاڑا جا سکتا ہے، نہ اسکرینوں سے غائب ہونے سے، اور نہ ہی مسخ کرنے اور گمراہ کرنے کی کوششوں سے۔ چنانچہ راستوں پر لٹکی ہوئی ان کی تصویریں تو محض ان تصویروں کا سایہ ہیں جو دلوں پر نقش ہیں، اور بینرز پر لکھا ہوا ان کا نام دراصل اس نام کی گونج ہے جو وجدان میں بسا ہوا ہے۔

اور میں لوگوں کے لیے اُن کی محبت اور اُن کے لیے لوگوں کی محبت کو بیان کرنے کی جتنی بھی کوشش کروں، میں ان میں سے کسی ایک کا بھی حق ادا نہیں کر پاؤں گا۔

پُروقار مسکراہٹ

اُن کی معروف صفات میں سے ایک اُن کی وہ کرشماتی شخصیت تھی جو رعب و جلال سے ملی ہوئی تھی۔۔۔ ایک ایسا رعب جو بغیر کچھ بولے ان پر چھایا رہتا تھا، جو انہیں پہلی بار دیکھنے والے کو ہکلانے پر مجبور کر دیتا، اور جو ان کے سامنے کھڑا ہوتا وہ ایک لطیف سی گھبراہٹ محسوس کرتا جو محبت کے ساتھ مخلوط ہوتی تھی۔

لیکن وہ اس گھبراہٹ کو خالص مہربانی، ایک مختصر سے جملے اور ایک پرسکون مسکراہٹ کے ذریعے دور کر دیتے تھے، جو نفس میں سکون اور اطمینان پیدا کر دیتی تھی؛ چنانچہ وہ اپنے مہمانوں کا استقبال ایسے سادہ اور صاف ستھرے جملوں سے کرتے تھے جو کان سے پہلے دل میں اتر جاتے تھے: ''آیئے، پانی پیجیے''، ''آرام سے بیٹھیے''، ''بے تکلف ہو کر بات کیجیے''۔

اور جہاں اِن کلمات کے اثر سے تناؤ پگھل جاتا تھا، وہیں وہ اپنے گھر میں اور اپنے اہل خانہ کے ساتھ ایسا لطیف مذاق فرماتے تھے جو ان

کے وقار کو ٹھیس نہیں پہنچاتا تھا، بلکہ ان کے رعب و جلال کو خوبصورتی اور اپنائیت کا ایک لمس عطا کر دیتا تھا۔

وہ ایک نایاب مساوات میں وقار اور نرمی کو اس طرح یکجا کرتے تھے، جو اُن کی موجودگی کو ایک سکون اور اُن کے مذاق کو ایک انس و محبت بنا دیتا تھا۔

وہ ہم سے پہلے سلام کرنے، خیریت پوچھنے اور اطمینان دلانے میں پہل فرماتے تھے، اور جب وہ کوئی پریشانی یا مسئلہ سنتے، تو معاملات کو ان کے اصل حجم پر لے آتے، پیچیدہ کو سادہ بنا دیتے، مشکل کو آسان کر دیتے، اور ایسے حقیقت پسندانہ اور دانشمندانہ حل اور راستے بتاتے، جس سے ہمیں یہ احساس ہوتا کہ صرف ان کے ہمیں سن لینے سے ہی ہمارے سینوں سے بوجھ ہٹ گیا ہے۔

خاموش رہنے والے

ہماری نجی نشستوں میں، ان کی خاموشی کلام سے زیادہ بلیغ ہوتی تھی۔ وہ بات نہیں کرتے تھے مگر تب ہی جب کلام کا کوئی مقصد ہو، اور وہ اپنے علم کا مظاہرہ شروع نہیں کرتے تھے، باوجود اُس علمی ذخیرے کی فراوانی کے جو وہ اپنے پاس رکھتے تھے۔

لیکن جب اُن سے سوال کیا جاتا، تو وہ ایسا جواب دیتے جو عقول کو علم سے سیر کر دیتا، اور دلوں کو معرفت سے سیراب کر دیتا؛ وہ دلیل و برہان کے ساتھ اور حکمت و بیان کے ساتھ جواب دیتے تھے، بغیر کسی اسراف یا تقصیر کے۔

یہاں تک کہ اپنے عوامی ظہور میں بھی، وہ خاموشی اور کلام کے درمیان توازن کے فن کے ماہر تھے، وہ جانتے تھے کہ کب خاموشی ہر خطبے سے زیادہ بلیغ پیغام بنتی ہے، اور کب لفظ نور کی ایک تلوار بنتا ہے، چنانچہ وہ ہر مقام کے لحاظ سے کلام کو، اور ہر خاموشی کے لیے اس کا پُر رعب اثر متعین کرتے تھے۔

اخلاق اور تقویٰ کے ترجمان

اُن کے اخلاق مجھے ان باتوں کی یاد دلاتے تھے جو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں پڑھتے ہیں، اور ایسا کیوں نہ ہو، جبکہ وہ نبوت اور ولایت کے مدرسے میں پروان چڑھے تھے، اور اس کی طہارت کے چشمے سے سیراب ہوئے تھے۔

میں نے اُنہیں دعائے مکارم اخلاق کا ایک زندہ مجسمہ دیکھا؛ اس دعا کا ہر فقرہ اُن کے طرزِ عمل میں دھڑکتا تھا، اور اس میں مذکور ہر اخلاق میں اُن کا وافر حصہ تھا۔

اور جب میں خطبہ متقین سے گزرتا، تو مجھے امیر المؤمنین علیہ السلام کے کلمات کو سمجھنے کے لیے تخیل کا سہارا لینے کی ضرورت پیش نہ آتی، کیونکہ سید عالیقدر خود ان کلمات کا بولتا ہوا مصداق اور اُن کے معانی کا روشن سایہ تھے۔ اور اگر ہم اللہ کی کتاب میں مومنین کی صفات کو یکجا کریں، تو ہم ان کا وجود اُن کی ذات میں ملاحظہ کریں گے۔

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اور صلۂ رحمی

اُن پر مسلط ہونے والے نامساعد حالات اور شدید دباؤ کے باوجود، جن کی وجہ سے اُن کے آس پاس موجود ہر شخص اُنہیں معذور سمجھتا تھا (ان کا عذر قبول کرتا تھا)، سید عالیقدر نے کبھی بھی ایک دن کے لیے بھی اپنے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک میں غفلت نہیں کی، اور نہ ہی کبھی صلۂ رحمی میں کوئی کمی کی۔

وہ اس بات کے شدید حریص تھے، وہ مختلف طریقوں سے محبت کے رشتوں کو دراز رکھتے تھے: مستقل خیریت دریافت کرنے، شفقت بھرے رابطے، عاجزانہ خدمت، ضرورت کے وقت مدد، اور جب بھی موقع ملتا ملاقات کی کوشش کے ذریعے سے۔

خوش لباسی اور بہترین ظاہری وضع قطع

میں جہاں کہیں بھی اُن سے ملتا، گھر میں یا کام پر، رات میں یا دن میں، تھکن کے اوقات میں یا آرام کے لمحوں میں، وہاں اُن کی شخصیت کا ایک پہلو ایسا تھا جو کبھی غائب نہیں ہوتا تھا: بہترین ظاہری وضع قطع (خوش لباسی) اور عمدہ خوشبو۔

میں اُنہیں ہمیشہ اپنے لباس کا خاص خیال رکھتے ہوئے، اور اپنے بالوں اور داڑھی کو باقاعدگی سے سنوارتے ہوئے دیکھتا تھا، وہ اس بات پر راضی نہیں ہوتے تھے کہ لوگ انہیں کسی ایسی حالت میں دیکھیں جو ان کے وقار کے شایانِ شان نہ ہو۔ اور وہ خاص طور پر بہت زیادہ عِطر لگاتے تھے، یہاں تک کہ اُن کی خوشبو جہاں کہیں بھی وہ تشریف لاتے ان سے پہلے پہنچ جاتی تھی، اور اُن کے رخصت ہو جانے

کے بعد بھی اس جگہ بسی رہتی تھی۔

اور وہ خوشبو آج بھی ہماری یادوں اور ہمارے دلوں میں بسی ہوئی ہے، ایک ایسی چھاپ بن کر جسے زمانے مٹا نہیں سکتے۔

بغیر گفتگو کے دعوت دینے والے

ہمارے والد ہمیں بطورِ خاندان اکٹھا نہیں کرتے تھے کہ وہ ہمارے سامنے کوئی وعظ و نصیحت فرمائیں، کیونکہ یہ اُن کا اسلوب ہی نہیں تھا، بلکہ وہ اپنے طرزِ عمل اور اپنے افعال سے ہمیں سکھایا کرتے تھے...

اپنی اُس خاموش گفتگو کے ذریعے جس کی تصدیق ان کا عمل کرتا تھا۔ ہم اُنہیں دیکھتے تھے کہ وہ اپنے آس پاس والوں کے ساتھ کیسا معاملہ کرتے ہیں، وہ کس طرح پورے خشوع کے ساتھ نماز کے لیے تیار ہوتے ہیں، وہ طہارت اور وضو کا کتنا خیال رکھتے ہیں، اور وہ کس طرح ہمیشہ اللہ کو یاد رکھتے ہیں، وہ اسے ہر چیز سے پہلے، اس کے اندر اور اس کے بعد دیکھتے تھے۔

ہم نے اُنہیں اس حال میں دیکھا کہ ذکرِ الٰہی نہ اُن کی زبان سے جدا ہوتا تھا، نہ اُن کے دل سے، اور نہ ہی ان کی حرکات و سکنات سے۔ وہ صرف اپنی زبان سے خطیب نہیں تھے، بلکہ وہ اپنے قول سے پہلے اپنے طرزِ عمل سے اللہ کی طرف دعوت دینے والے تھے۔

وہ امام صادقؑ کی اس حدیث کے سچے ترجمان تھے: "کونوا دعاةً للناس بغیر ألسنتکم۔۔۔" (لوگوں کو اپنی زبانوں کے علاوہ (اپنے عمل سے) دعوت دینے والے بنو)۔ (١)

(١) الکافی، جلد ٢، صفحہ ٧٨

خاندان کے بیان میں

''سید حسن'' ہونے کا کیا مطلب ہے؟

جب میں چھوٹا تھا، تو اسکول کے طلبہ روزانہ میرے پاس آتے تھے اور معصومانہ جوش و خروش کے ساتھ مجھ سے پوچھتے تھے: ''کیا واقعی سید حسن نصر اللہ آپ کے والد ہیں؟!''۔

تو میں سادگی سے جواب دیتا: ''جی ہاں''۔

تو ان کے چہروں پر حیرت اور گہرے تاثرات ابھر آتے تھے۔ لیکن میں اس وقت یہ نہیں سمجھ پاتا تھا کہ میرے والد کا ''سید حسن'' ہونا آخر کیا معنی رکھتا ہے؟

میری نظر میں میرے والد ایک نہایت شفیق اور عاجز انسان تھے، جو ہمارے ساتھ محبت اور گرمجوشی سے پیش آتے تھے، اور اپنے آس پاس موجود افراد، جیسے حاج جہاد، حاج نبیل اور تمام بھائیوں کے ساتھ الفت، بھائی چارے، بلکہ سچی پدرانہ شفقت سے بھرپور رویہ رکھتے تھے۔

وہ ہم سے کبھی اپنے بارے میں، نہ اپنے منصب کے بارے میں، نہ اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں، اور نہ ہی کسی بہادری یا مسؤولیت کے بارے میں بات کرتے تھے، اور میں تو اصل میں یہ بھی نہیں سمجھتا تھا کہ 'حزب اللہ کے جنرل سیکرٹری' کے عہدے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔

میں صرف اتنا ہی جانتا تھا کہ لوگ اُن سے محبت کرتے ہیں۔۔۔ بہت زیادہ محبت، ایک ایسی والہانہ محبت جس کی کوئی حد نہیں تھی۔

یہاں تک کہ میں بڑا ہوا، اور آہستہ آہستہ میں نے سمجھنا شروع کیا کہ میرے والد کون ہیں۔ اور مجھے اندازہ ہوا کہ ان کی انتہائی عاجزی، اعلیٰ اخلاق اور نفیِ ذات ہی تھی جو مجھ سے اُن کے اس عظیم و رفیع مقام کی حقیقت کو چھپائے ہوئے تھی۔

یاد کا اظہار

میرے والد کا رجحان نشید یا ترانے سننے کی طرف زیادہ نہیں تھا۔ لیکن میرے بچپن میں، میں ان کی موجودگی میں کچھ نشید سننا پسند کرتا تھا، چنانچہ وہ مجھے میری مرضی پر چھوڑ دیتے تھے، نہ مجھ سے آواز کم کرنے کو کہتے اور نہ ہی کسی بیزاری کا اظہار کرتے، بلکہ کبھی کبھار میرے ساتھ سنتے بھی تھے۔

اور اگر ایسا اتفاق ہوتا کہ وہ میرے ساتھ پہلی بار کوئی نئی نشید سنتے، تو وہ اُن کی یادداشت میں مجھ سے وابستہ ہو جاتی تھی۔ چنانچہ جب وہ بعد میں کبھی اسے ٹیلی ویژن پر سنتے تو مجھ سے فرماتے: ''میں نے فلاں نشید سنی۔۔۔ اور مجھے تم یاد آ گئے''۔

اور اُن کلمات کا میرے نفس پر ایک گہرا اثر ہوتا تھا، جیسے کہ یہ محبت کا ایک چھوٹا سا پیغام ہو جو کبھی بھلایا نہ جا سکے۔

ایک بہترین سامع

ہمارے والد ہم سے کبھی اپنے دُکھ درد کا شکوہ نہیں کرتے تھے اور نہ ہی ہمیں اپنی مشکلات کے بارے میں بتاتے تھے، لیکن وہ سب کے دُکھ درد کو غور سے سننے والے تھے: خاندان کے لوگوں کے لیے بھی اور خاندان سے باہر والوں کے لیے بھی، بڑے کے لیے بھی اور چھوٹے کے لیے بھی، پیچیدہ مسئلے کے لیے بھی اور معمولی معاملے کے لیے بھی، خواہ عام محفل ہو یا نجی خلوت۔

ان کا سینہ بہت کشادہ تھا، وہ کسی مخالف رائے سے تنگ دل نہیں ہوتے تھے، اور نہ ہی کسی نصیحت سے اکتاتے تھے، خواہ وہ کسی چھوٹے بچے کے منہ سے ہی کیوں نہ نکلی ہو۔

وہ ایک حقیقی سامع تھے، جو گہرائی اور پوری توجہ کے ساتھ بات سنتے تھے، پھر کوئی حل پیش کرتے، یا دلاسا دیتے، یا اپنی گفتگو کی گرمجوشی سے آپ کا بوجھ ہلکا کر دیتے۔۔۔ یہاں تک کہ وہ اپنے چھوٹے پوتے پوتیوں کے دُکھوں کو بھی چھوٹا نہیں سمجھتے تھے، چنانچہ وہ ان

کے اسکول کے شکوے بھی سنتے تھے، اور انہیں اپنا وقت، اپنی توجہ، اپنی حکیمانہ رائے، اور اپنی نہ ختم ہونے والی شفقت عطا فرماتے تھے۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے، تو ہمارا ہر دکھ اُن کا روشن چہرہ دیکھنے سے، یا اُن کی پر سکون آواز سننے سے ہی دور ہو جاتا تھا۔

انبیاء علیہم السلام کے قصے

جب میں سات سال کا بچہ تھا، تو میری والدہ میرے پاس بیٹھتی تھیں اور بچوں کے لیے انبیاء کے قصوں کے سلسلے میں سے پڑھ کر سناتی تھیں، یہاں تک کہ میری آنکھ لگ جاتی۔

اور کبھی کبھار۔۔۔ میرے والد اپنی پر سکون آواز میں پڑھنے کی ذمہ داری سنبھال لیتے تھے، چنانچہ وہ قصہ سناتے رہتے یہاں تک کہ میں ان کے الفاظ کی گونج پر سو جاتا۔

شفیق دادا

میری دونوں بیٹیوں فاطمہ اور نرجس نے اپنے دادا کو صرف چند ہی بار دیکھا تھا، جہاں تک رقیہ کا تعلق ہے، تو اس نے اُنہیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے باوجود، اپنی پوتیوں کے لیے ان کی محبت بالکل عیاں تھی، جو چھپتی نہیں تھی، اور وہ ان پر شفقت اور محبت نچھاور کرتے تھے۔

ہر ملاقات میں، فاطمہ اور نرجس شروع میں اُنہیں دیکھ کر حیرت کا اظہار کرتی تھیں؛ کیونکہ ہمیں اُنہیں اسکرین پر اُن کے عمامے اور رعب و جلال کے ساتھ دیکھنے کی عادت تھی۔

اور ملاقاتوں کے درمیانی طویل وقفے اس حیرت کو مزید بڑھا دیتے تھے، لیکن وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اس فاصلے کو کیسے سمیٹا جائے: ایک ہنسی، کسی کھیل، ایک گرمجوش گلے لگانے، یا ٹافی (مٹھائی) کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کے ذریعے۔

اور اُن کے آخری دنوں میں، میری والدہ میری بیٹیوں کے لیے تحائف خرید لاتی تھیں اور میرے والد اُنہیں اپنے ہاتھوں سے اُن کے سامنے پیش کرتے تھے، چنانچہ یہ لمحوں میں ہچکچاہٹ کی دیوار گرانے کی ایک جادوئی چابی بن جاتا تھا۔

۔۔۔وہ دونوں اُن کی گود میں بیٹھ جاتی تھیں، وہ اپنے شفیق ہاتھ سے انہیں کھانا کھلاتے تھے، وہ دونوں اُن کی داڑھی سے کھیلتی تھیں تو وہ بغیر کسی بیزاری کے ہنس پڑتے تھے، اور وہ کسی کو اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ انہیں ان کے بازوؤں کے درمیان سے اٹھائے۔

اور اُن کی شہادت سے ڈیڑھ ماہ قبل، جب رقیہ پیدا ہوئی، تو اُنہوں نے ہم سے اس کی تصویر بھیجنے کی فرمائش کی تاکہ وہ اسے دیکھ سکیں، چنانچہ اُنہوں نے تصاویر کے ذریعے ہی اسے دیکھنے پر اکتفا کیا۔ اور جس طرح اُنہوں نے اس کی تصویر دیکھ کر اسے پہچانا، اسی طرح جب وہ بڑی ہو گی تو وہ بھی ان کی تصویریں دیکھ کر اُنہیں پہچانے گی۔۔۔

جس چیز کو وہ پسند کرتے اس میں کامیابی ہوتی۔

وقت گزرنے اور تجربات کے بڑھنے کے ساتھ، ہم نے یعنی ہم سید عالیقدر کی اولاد نے، ایک عجیب راز دریافت کیا:

کہ ہمارے والد جس چیز کو پسند کرتے تھے، اس میں خدا کی جانب سے کامیابی عطا کر دی جاتی تھی، اور اس کے دروازے آسانی سے کھل جاتے تھے خواہ وہ لوگوں کے معیار کے مطابق کتنا ہی مشکل کیوں نہ معلوم ہوتا ہو۔

جہاں تک اس چیز کا تعلق ہے جسے وہ پسند نہیں کرتے تھے، تو اگرچہ وہ اعلانیہ اس کی مخالفت نہیں کرتے تھے، بلکہ اگر وہ ہم سے یہ بھی کہہ دیتے: ''مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے، آپ کوشش کر کے دیکھ لیں''، تب بھی ہم جلد ہی دیکھتے کہ دروازے بند ہو جاتے ہیں، خواہ بظاہر راستہ کتنا ہی ہموار کیوں نہ ہو۔ گویا کہ کامیابی کا ہاتھ اس راستے سے اٹھا لیا گیا ہو۔

اور ان تجربات کے ذریعے ہمارے دلوں میں ایک یقین راسخ ہو گیا: جہاں اُن کا دل ہوتا ہے، وہیں خیر و بھلائی پوشیدہ ہوتی ہے۔ پس اگر اُن کا دل کسی معاملے کی طرف مائل ہو جاتا، تو اس کے راستے آسان کر دیے جاتے، اور اگر وہ اس سے اعراض کرتے تو وہ مشکل ہو جاتا، خواہ وہ تمام حساب کتاب میں کتنا ہی آسان دکھائی دیتا ہو۔

بے غرض اور کسی پر بوجھ نہ بننے والے

میرے والدان شریف اور اعلیٰ ظرف انسانوں میں سے تھے کہ اگر آپ اُن کی خدمت کرتے۔۔۔تو وہ آپ کو یہ احساس دلاتے کہ خدمت اُن کی نہیں بلکہ آپ کی کی جارہی ہے۔

وہ کبھی بھی اپنی ذات کے لیے فرمائشیں کرنے والے یا اپنے آس پاس کے لوگوں پر بوجھ بننے والے نہیں تھے، بلکہ وہ کسی کو اپنی طلب سے تھکانے کے بجائے کچھ حد تک مشقت خود اٹھانے کو ترجیح دیتے تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ ان کی خدمت کے لیے ہماری محبت کو اور ہمارے اس عمل کو ان کے ساتھ حسنِ سلوک اور ان کے قرب کا ذریعہ سمجھنے کو اچھی طرح جانتے تھے، لیکن اس سب کے باوجود اگر وہ کبھی کوئی تقاضا کرنے پر مجبور ہو بھی جاتے، تو اسے لطیف ترین الفاظ میں ڈھالتے تھے۔ وہ کبھی یوں نہیں کہتے تھے: ''میرے لیے پانی کا ایک گلاس لاؤ''۔

بلکہ وہ نرمی سے پوچھتے تھے: ''کیا پانی کا ایک گلاس مل سکتا ہے؟''

اور وہ ہمیشہ خدمت کا جواب شکریہ اور مسکراہٹ سے دیتے تھے، یہاں تک کہ وہ برادران جنہوں نے اُن کی خدمت کی ذمہ داری سنبھال رکھی تھی، اکثر اُن کے اخلاق، اُن کی عاجزی اور اُن کے بہترین برتاؤ کے سامنے خود کو شرمندہ پاتے تھے۔

جلد شادی پر حوصلہ افزائی

سولہ سال کی عمر میں، میں نے شادی کی نیت سے شناسائی کے لیے آگے بڑھنے کی اپنی خواہش کا اُن سے کھل کر اظہار کیا، تو انہوں نے پوری توجہ سے میری بات سنی، اور اس قدم پر برکت کی دعا دی، اور مجھ سے یہ نہیں کہا کہ ''تم ابھی چھوٹے ہو''۔ بلکہ انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی، بالکل اسی طرح جیسے وہ عوامی خطبات میں منبر سے کیا کرتے تھے، جہاں وہ جلدی شادی کی فضیلتوں کی تعریف فرماتے تھے۔

پھر سترہ سال کی عمر میں، انہوں نے میرا نکاح پڑھوایا۔۔۔اور وہ اس امر کے مکمل ہونے پر بہت خوش اور مسرور تھے۔

جذبات کے بیان میں

اکلوتی خواہش

ہمارے خاندان کی نجی نشستوں میں سے ایک نشست میں، خاندان کے ایک فرد نے اُن سے سوال کیا: ''اگر آپ سے کہا جائے کہ آپ کی کوئی ایک ایسی خواہش ہے جس کا پورا ہونا یقینی ہے، خواہ وہ کچھ بھی ہو، تو وہ خواہش کیا ہو سکتی ہے؟''

اُنہوں نے جواب دینے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی، بلکہ شوق اور تڑپ سے بھرپور لہجے میں فرمایا: ''میری یہ آرزو ہے کہ میں اپنی آنکھوں سے ان واقعات کو دیکھوں جو سن ٦١ ہجری میں محرم الحرام کے دسویں دن (یومِ عاشور) کربلا میں رونما ہوئے تھے''۔

یہ آرزو اس لافانی سانحے کے ساتھ ان کے گہرے لگاؤ اور ان کی ایسی وفاداری و عقیدت کا خلاصہ تھی جو زمان و مکان کی حدود سے بالاتر تھی۔

تاریخ کے مطالعے سے ان کی محبت

میں ہمیشہ ان کے کتب خانے میں تاریخی کتابوں کی کثرت دیکھتا تھا، اور یہ ایک ایسے حقیقی لگاؤ کی علامت ہے جو صرف اسی شخص کے پاس ہوتا ہے جو ماضی کو حال کا آئینہ اور مستقبل کی تعمیر کی چابی سمجھتا ہو۔

وہ تاریخ کے واقعات کا مطالعہ کرتے، شخصیات کا تجزیہ کرتے، اور عبرتیں و اسباق حاصل کرتے تھے۔ اور اگر کبھی اپنے مختصر سے فارغ وقت میں ان کے لیے کچھ دیکھنے کا موقع بنتا، تو وہ حقیقی واقعات پر مبنی تاریخی فلموں کا انتخاب کرتے؛ پس فن میں سے جو چیز انہیں سب سے زیادہ اپنے سحر میں لیتی تھی، وہ وہی تھی جو اپنے اندر کوئی پیغام اور گہرائی رکھتی ہو، جو عارضی تفریح سے بالاتر ہو۔

ان کی تاریخی یادداشت ان کی گفتگو میں ہمیشہ حاضر رہتی تھی، وہ واقعات کا حوالہ دیتے، اور ماضی اور حال کے درمیان ایسی باریک بین تشبیہات کے ساتھ موازنہ کرتے جو سننے والے کو حیران کر دیتیں، گویا وہ تاریخ کے صفحات کو حاضر کر رہے ہوں تاکہ وہ ہمارے حال

کو روشن کر سکیں۔

محبت اور شہادت کے رفقاء

ہمارے والد اکثر ہم سے حاج عماد مغنیہ اور حاج قاسم سلیمانی رضوان اللہ علیہما کے بارے میں بات کرتے تھے، اور ان کا ذکر محبت، وفا اور یادِ ماضی سے لبریز الفاظ میں کرتے تھے۔

اور میں نے خود حاج قاسم کے ساتھ ان کی بعض ملاقاتوں کا مشاہدہ کیا، تو میں ایک غیر معمولی تعلق دیکھتا تھا جو محبت اور اعتماد سے چھلک رہا ہوتا تھا، ایک ایسا تعلق جو نہ صرف جہاد کے میدانوں میں باہمی تعاون پر مبنی تھا، بلکہ روحانی ہم آہنگی اور قلبی وابستگی پر قائم تھا...

اس تعلق کی گہرائی کو ظاہر کرنے کے لیے صرف اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ: ان میں سے ہر ایک دوسرے پر اپنی جان نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔

اللہ کی خاطر اخوت نے ان کو یکجا کیا تھا، اور ایک ہی راستے نے ان کا ساتھ دیا: جہاد کا راستہ، اور ان دونوں کا انجام بھی ایک ہی ہوا: شہادت۔

علم اور اہل علم سے اُن کا لگاؤ

سید عالیقدر کو علماء اور طالب علموں سے شدید محبت تھی، وہ ان کے قرب میں ایک ایسی بے مثال تسکین پاتے تھے اور ان کی مجالس میں ایک سکون اور مسرت محسوس کرتے تھے، اور ان محافل سے خوش ہوتے تھے جن میں دین اور فقہ کے بارے میں گفتگو ہوتی تھی، اور ان مکالموں سے مانوس ہوتے تھے جو احادیث اور علمی مسائل کا احاطہ کرتے تھے۔ اور مجھے ایک سے زائد علماء نے بتایا کہ وہ مذاکرے اور مباحثے میں ان کی رفاقت میں طویل گھنٹے گزارتے تھے، اور وہ اتنے پر ہی بس نہیں کرتے تھے، بلکہ ان سے فرماتے تھے کہ وہ اُن کے پاس اپنے قیام کو مزید طویل کریں، کیونکہ وہ اِن ملاقاتوں میں دل کا نور اور روح کا سکون محسوس کرتے تھے۔

اور اُن کی شہادت کے بعد، میری والدہ نے مجھے بتایا کہ جب بھی میں کسی دینی مسئلے یا علمی استفسار کے بارے میں پوچھنے کے لیے اُن

سے رابطہ کرتی تو ان کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھتا تھا، گویا فقہ کا ایک ہی سوال ان کے دل سے سیاست کی تھکن اور کام کے شور وغل کو دور کر دیتا تھا، اور یہ اُن کی روح کے لیے ٹھنڈک اور سلامتی بن جاتا تھا۔

علماء کا اُن پر اتفاق

اُن سے محبت کرنے والے بعض علماء، محض مزاح اور دلچسپی کے طور پر، ایک ایسے لطیف امتحان پر متفق ہوتے جس کے ذریعے وہ اُن کی علمی یادداشت کا امتحان لیتے؛ وہ اُن کے سامنے پرانے علمی مطالب پیش کرتے، جن کے بارے میں ان کا خیال ہوتا کہ وہ ان کی کثیر مصروفیات اور بھاری ذمہ داریوں کے باعث ذہن سے اوجھل ہو چکے ہوں گے۔

اور ان علماء میں سے جن کے ساتھ وہ محبت بھری دوستی اور علم کی رفاقت میں یکجا تھے، شہید سید ہاشم صفی الدین اور شہید شیخ نبیل قاووق رضوان اللہ تعالیٰ علیہما تھے۔

لیکن وہ جلد ہی حیران رہ جاتے: کیونکہ جس چیز کو وہ اُن کے ذہن سے دور سمجھ رہے ہوتے وہ پوری بیداری اور صفائی کے ساتھ موجود ہوتی، اور جسے وہ یادداشت سے محو ہو جانے کا گمان کرتے وہ اس طرح راسخ ہوتی گویا اُنہوں نے اسی گھڑی اِسی کا مطالعہ کیا ہو۔

وہ انہیں پورے اعتماد اور اطمینان کے ساتھ، اور ایک ایسی پختہ دلیل کے ساتھ جواب دیتے جو ایک ایسے ذہن کی دلالت کرتی جو امت کے درد میں تو مصروف تھا، لیکن وہ ایک لمحے کے لیے بھی علم کے ان خزانوں سے غافل نہیں ہوا تھا جن کے لیے اور جن پر اُنہوں نے زندگی گزاری تھی۔

جہاد کے بیان میں

شہد سے بھی زیادہ میٹھا

ان کی شہادت کے چند ہی دنوں بعد میں نے اُنہیں خواب میں دیکھا، اور اُن کی رحلت کے بعد یہ میری اُن سے پہلی روحانی ملاقات تھی۔ میں نے شوق اور گہری یاد کے ساتھ ان سے پوچھا: ''باباجان، آپ نے موت کو کیسا پایا؟''

تواُنہوں نے مسکراہٹ اور کامل اطمینان کے ساتھ مجھے جواب دیا: ''شہد سے بھی زیادہ میٹھا''۔

مجاہدِ کبیر

رہبر معظم امام خامنہ ای رضوان اللہ علیہ نے اُن کی جہادی سوانح کو دو بلیغ کلمات میں سمیٹ دیا جب انہوں نے انہیں ''المجاھد الکبیر'' قرار دیا۔ ایک ایسا وصف جو اپنے اندر قربانی وعطا کی بلند ترین چوٹیاں اور مختلف میدانوں میں جہاد کے پہاڑ سموئے ہوئے ہے: خواہ وہ عسکری میدان ہو، سیاسی، ثقافتی یا سماجی۔۔۔ وہ ان میدانوں میں محض حاضر ہی نہیں رہتے تھے، بلکہ ایک ایسے پیشرو قائد تھے جو دوسروں کے لیے راستہ روشن کرتے تھے۔

تاہم، وہ میدان جس میں وہ دوسروں سے سب سے منفرد نظر آئے، اور جو دوسرے تمام میدانوں میں ان کا سب سے بڑا مددگار ثابت ہوا، وہ 'جہادِ اکبر' کا میدان تھا۔۔۔ یعنی نفس کے ساتھ جہاد کا میدان۔

کیونکہ اس معرکے میں دشمن کہیں زیادہ شدید اور سخت ہوتا ہے، اور اس میں شکست کہیں زیادہ دردناک اور بھاری ہوتی ہے۔ اور یہ جہاد اس وقت کتنا مشکل ہو جاتا ہے جب اس کا کرنے والا ایسا صاحبِ قدرت، صاحبِ اختیار اور لوگوں کے دلوں میں اس حد تک والہانہ محبت رکھنے والا ہو کہ لوگ اُن کی یادگار کے طور پر اُن سے منسوب اشیاء کو حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے آگے بڑھ رہے ہوں۔

اس سب کے باوجود، سید عالیقدر عاجزی وانکساری کی ایک لازوال مثال بنے رہے، اور انہوں نے اپنی زندگی میں امام زین العابدین علیہ السلام کی ان کے لازوال مناجات یعنی دعائے مکارم الاخلاق میں مانگی گئی اس دعا کو مجسم کر دکھایا:

وَلَا تَرْفَعْنِي فِي النَّاسِ دَرَجَةً إِلَّا حَطَطْتَنِي عِنْدَ نَفْسِي مِثْلَهَا

ترجمہ۔۔اور لوگوں میں میرا ایک درجہ بھی بلند نہ فرما، مگر یہ کہ اتنا ہی مجھے خود میری اپنی نظروں میں گرادے۔

وہ کب سوتے تھے؟

میرے بچپن میں جب میں اُن کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے رہتا تھا، تو منظر ہمیشہ ایک ہی ہوتا تھا جو کبھی بدلتا نہیں تھا: وہ ہر وقت مصروف رہتے تھے۔۔۔آپ اُنہیں ہر کمرے میں، اور ہر گھنٹے فون پر مصروف، کاغذات میں ڈوبے ہوئے، یا اسکرین کے سامنے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے دیکھتے...

میں سو جاتا، بیدار ہوتا، اسکول جاتا، واپس آتا، دوپہر کا کھانا کھاتا، کھیلتا، پڑھتا، اور پھر سونے کے لیے تیار ہو جاتا...

اور یہ سب کچھ اس حال میں ہوتا کہ وہ اب بھی جاگ رہے ہوتے، یہاں یا وہاں کام میں مگن ہوتے۔ میں بچپن کی حیرت کے ساتھ خود سے سوال کرتا تھا: وہ کب آرام کرتے ہیں؟ وہ کب سوتے ہیں؟ بلکہ کیا وہ اصلاً سوتے بھی ہیں یا نہیں؟

روزمرہ کی مشقت

اُن کے ساتھ اپنی پوری زندگی میں، میں نے اُن کی گراں قدر تھکن اور مشقت کا کچھ حصہ قریب سے دیکھا؛ ایک ایسی محنت جو وہ رات دن کرتے تھے، وہ آرام کا ذائقہ تک نہیں جانتے تھے، اور وہ جس راستے پر بھی چلتے وہ مشقتوں سے گھرا ہوتا تھا۔

اس کی سب سے معمولی مثال وہ پیچیدہ اور طویل سیکیورٹی اقدامات تھے جن کا وہ روزانہ سامنا کرتے تھے، تاکہ ان کی زندگی کی حفاظت کی جاسکے جو ہر لمحہ خطرے میں رہتی تھی۔

گھر سے نکلنا، گھر میں داخل ہونا، کام پر جانا، ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا۔۔۔یہ سب آسان اور معمولی معاملات نہیں تھے۔

بلکہ یہ ایسے اقدامات تھے جن کے لیے انتہائی محکم تدبیر، پوشیدگی اور باریک بین احتیاط کی ضرورت ہوتی تھی۔

اس سب کے باوجود، ہم نے کبھی ان سے کوئی شکوہ نہیں سنا۔ وہ ہر چیز پر صبر کرتے، اور خاموشی سے جھیلتے تھے، اور اپنی تھکن کا اظہار صرف اللہ کے سامنے کرتے تھے۔ اُن کا یہ صبر کوئی سرسری عادت نہیں تھی، بلکہ ایک خالص عبادت تھی جس سے وہ اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنے کے لیے قوت حاصل کرتے تھے۔

قائدانہ ردِ عمل

ایک سے زیادہ مرتبہ، میں اپنے والد کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا جب اُنہیں کسی ایسے قائد (کمانڈر) کی شہادت کی خبر ملتی جن کے ساتھ ان کا گہرا محبت، وفا اور دوستی کا تعلق تھا۔

میں اُن کے ردِ عمل کا منتظر رہتا، کسی ایسے آنسو یا بے چینی کی امید میں جو اتنے بڑے نقصان کا پتا دے، لیکن وہ کبھی بھی ایسے مضطرب نہیں ہوتے تھے۔

بلکہ وہ سراپا سکون اور ثبات بن جاتے، اور ان الفاظ کا وِرد کرتے:

"لا حول ولا قوة إلا بالله" اور "إنّا لله وإنّا إليه راجعون"

پھر وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو جاتے۔۔۔ سوچ میں ڈوب جاتے، اور ابھی کچھ ہی لمحے گزرتے کہ وہ کھڑے ہو جاتے تاکہ رابطے قائم کریں، لازمی انتظامات کو ترتیب دیں، اور فوراً شہید کا جانشین مقرر کریں؛ گویا وہ اپنے قول سے پہلے اپنے عمل سے کہہ رہے ہوں: "یہ راستہ رُکنے والا نہیں۔۔۔ اور یہ کارواں یونہی جاری رہے گا"۔

مہارتوں کے بیان میں

غیر معمولی طرزِ فکر

آخری پانچ سالوں میں، میں جان بوجھ کر اپنے والد کے سامنے کچھ ایسے سوالات رکھتا تھا جن کے جوابات مجھے پہلے سے معلوم ہوتے تھے۔ میرا مقصد جواب حاصل کرنا نہیں تھا، بلکہ ان کے سوچنے کے انداز کو دریافت کرنا تھا: وہ معاملات کو کیسے نمٹاتے ہیں؟ اُن کا تجزیہ کیسے کرتے ہیں؟ اور اُنہیں کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

میں معاملات کو جانچنے میں اُن کے پاس ایک غیر معمولی اور منفرد نظر پاتا تھا۔ وہ تمام پہلوؤں کی طرف متوجہ ہوتے، ان کا باریک بینی سے وزن کرتے، اور پھر حیرت انگیز گہرائی، روانی اور سرعت کے ساتھ نتیجے تک پہنچ جاتے۔

یہاں تک کہ آپ کو یوں گمان ہوتا گویا وہ خیالات کے درمیان اس طرح سفر کر رہے ہیں جیسے کوئی مانی ہوئی اور بدیہی حقیقتوں کے درمیان چل رہا ہو۔

اور حیرت کی بات یہ تھی کہ بعض ایسے مسائل میں جو مجھے بہت معمولی اور سادہ معلوم ہوتے تھے، وہ مروجہ سوچ سے ہٹ کر مختلف جواب دیتے، جس کی بنیاد اُن باریک نکات پر ہوتی جن کی طرف کسی اور کا دھیان مشکل ہی سے جاتا تھا۔ پس جب وہ جواب دیتے تو ایسا مطمئن کر دیتے کہ آپ کے اپنے نظریات بدل جاتے اور معاملات کے بارے میں آپ کا نقطہ نظر بنیاد سے ہل کر رہ جاتا۔

جُدا رکھنے کا ہنر

ان بھاری ذمہ داریوں، روزمرہ کے تفکرات اور نہ ختم ہونے والی تھکن کے باوجود جو اُنہیں درپیش رہتی تھی، میں جب بھی اُنہیں گھر لوٹتے ہوئے دیکھتا، اُن کے چہرے پر ایک خوبصورت مسکراتی رونق ہوتی تھی۔

وہ ''جدا رکھنے کے ہنر'' (کام اور گھر کو الگ الگ رکھنے) میں بے حد ماہر تھے: وہ باہر کی پریشانیوں کو گھر کی گرمجوشی اور خاندان کے

سکون سے بالکل الگ کر دیتے تھے۔

مجھے یاد ہے ایک مرتبہ میں نے ان سے شکایت کی کہ کثرتِ افکار کی وجہ سے مجھے سونے میں دشواری ہو رہی ہے، تو انہوں نے نرمی سے فرمایا:

''تمہیں دونوں معاملوں کے درمیان تفریق کرنی چاہیے، جس چیز سے تمہیں فکر لاحق ہے اس کے بارے میں سوچنا بند کر دو تاکہ تم سو سکو''۔

میں نے اُن کی اس نصیحت پر عمل کیا تو مجھے جلدی ہی نیند آ گئی، اور میں نے دل ہی دل میں حیرت سے کہا: میری پریشانیاں ان کے تفکرات کے سامنے بھلا کیا حیثیت رکھتی ہیں؟ وہ کیسے اتنے بھاری بوجھ اٹھانے کی طاقت رکھتے تھے، اور پھر گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اُنہیں وہیں چھوڑ دیتے تھے تاکہ ہمارے پاس ایک پر سکون چہرے اور شفیق دل کے ساتھ آئیں؟

مطالعے کی مہارت

میں اپنے والد کے مطالعہ کرنے کے طریقے پر حیران ہوتا تھا؛ جیسے ہی اُن کی نظریں صفحے کی ابتدا پر پڑتیں، وہ بڑی روانی سے پھسلتی ہوئی صفحے کے آخر تک پہنچ جاتیں اور وہ فوراً ہی اگلے صفحے کی طرف بڑھ جاتے۔

وہ (کسی جملے کو) نہ تو دہراتے تھے اور نہ ہی رکتے تھے، بلکہ مکمل توجہ اور ارتکاز کے ساتھ حیرت انگیز تیز رفتاری سے پڑھتے تھے، گویا الفاظ اُن کی آنکھوں کے سامنے سے گزرتے ہی لمحوں میں اُن کی یادداشت پر نقش ہو جاتے ہوں۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، تو میرا دھیان اکثر بٹ جاتا تھا جس کی وجہ سے میں عبارتوں کو بار بار دہراتا تھا، یا کسی صفحے پر پہنچ کر مجھے اچانک احساس ہوتا کہ میرا دھیان پچھلی باتوں کی طرف تھا ہی نہیں۔ لیکن وہ کبھی بھی اس مسئلے کا شکار نہیں ہوئے؛ بلکہ جب بھی میں کوئی ایسا صفحہ کھولتا جس پر اُنہوں نے کوئی نشان لگایا ہوتا، اور اُن کے مطالعہ کرنے کے کئی گھنٹوں بعد بھی میں اُن سے اس کے مضمون کے بارے میں پوچھتا، تو وہ مجھے فوراً ایسے جواب دیتے گویا وہ اسے ابھی دوبارہ پڑھ رہے ہوں۔

اُن کا وسیع مطالعہ

سید عالیقدر محض سیاسی امور کے مبصر یا صرف علومِ دینیہ کے شائق نہیں تھے، بلکہ وہ انتہائی باریک بینی اور گہری بصیرت کے ساتھ، لمحہ بہ لمحہ تمام معاملات کی تفصیلات پر نظر رکھتے تھے۔

سیاست میں، جو وفد بھی اپنے علاقے کے حالاتِ حاضرہ پر تبادلہ خیال کرنے کے لیے اُن سے ملنے آتا، وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا کہ سید عالیقدر اُن سے پہلے ہی اس منظر نامے کا جائزہ لے چکے ہیں: وہ اعداد و شمار اور حقائق سے واقف ہوتے، اُن کا تجزیہ کر چکے ہوتے، اور حل اور تجاویز بھی تیار رکھتے۔

اور علم میں، خاص طور پر ان موضوعات میں جن سے اُنہیں گہرا لگاؤ تھا، جیسے کہ مسئلہ مہدویت، تو وہ اس بارے میں شائع ہونے والی کسی بھی نئی کتاب کو حاصل کرنے میں سب سے آگے ہوتے، اسے پڑھتے اور اس کے حاشیوں پر اپنے تاثرات و ملاحظات درج کرتے۔

کتنے ہی مصنفین اُن کے پاس اپنی کتاب کا ہدیہ پیش کرنے آتے، یہ گمان لیے کہ وہ شاید سید عالیقدر کی نظروں سے پہلی بار گزر رہی ہو، لیکن سید عالیقدر خود اُن سے (کتاب کے متن پر) بحث شروع کر دیتے، اور اُن کے سامنے کتاب کا ایسا نسخہ پیش کرتے جو اُن کے لکھے ہوئے حاشیوں اور ملاحظات سے بھرا ہوتا؛ یہ اس بات کا ثبوت ہوتا کہ وہ صرف معلومات حاصل کرنے پر اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ (علمی کاموں میں) برابر کے شریک ہوتے تھے اور اپنے گراں قدر اضافے بھی پیش کرتے تھے۔

مصنف کے بارے میں

- حوزہ علمیہ، قم مقدسہ کے طالب علم ہیں۔
- لبنان کے سابقہ حوزاتِ علمیہ کے طالب علم:
  - حوزہ الرسول الاکرم ﷺ- بیروت۔
  - حوزہ بقیۃ اللہ الاعظم عجل اللہ فرجہ الشریف- جنوب لبنان۔
- جامعہ المعارف (المعارف یونیورسٹی) بیروت کی فیکلٹی آف میڈیا اینڈ آرٹس سے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے شعبے میں بیچلر کی ڈگری (گریجویشن) حاصل کر رکھی ہے۔
- متعدد شارٹ ڈاکومنٹری فلموں (تھیسس/گریجویشن فلمز) کے سابق پروڈیوسر اور ڈائریکٹر ہیں جن تمام نے 'ممتاز' (Excellent) گریڈ حاصل کیا۔ان میں سے مصنف کی اپنی تیار کردہ ڈاکومنٹری فلم ''من نظرۃ''(ایک نظر سے) نے اس وقت اپنے پورے بیچ میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔
- کتاب ''ذکریاتي مع أبي''(میرے والد کے ساتھ میری یادیں) تحریر و تصنیف کے میدان میں اُن کا پہلا قدم ہے۔